کرفیو
سخت ہے...
انیس رفیع

کرفیو سخت ہے

(افسانے)

کرفیو سخت ہے

انیس رفیع

تقسیم کار

کتابستان، چندوارہ، مظفر پور-۸۴۲۰۰۱ (بہار)

کتاب کا نام	:	کرفیو سخت ہے
کہانی کار	:	انیس رفیع
پتہ	:	۴۰ راتو سرکار لین،
		کولکتہ-700073
		فون نمبر:033-2352191,4480151
سال اشاعت	:	۲۰۰۳ء
سرورق	:	دبیر کمزور
ناشر	:	عزیز رفیع
طباعت	:	
کمپوزنگ	:	ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ
		گذری، پٹنہ سیٹی-۸۰۰۰۰۸
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے

Title: **Curfew Sakht Hai (Short stories)**

Author: Anis Rafi

Year of pub: 2002, Price: Rs.150/-

DISTRIBUTOR

KITABISTAN

Chandwara, Muzaffarpur-842001 (BIHAR)

انتساب

باوا کے نام

جن کی نیکیاں
مصیبت کے وقت
ہم گنہ گار اولادوں کے لئے
ڈھال بن جاتی ہیں

وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا
غالبؔ

یہ SPACE

جبّو، جانسو، جوہا اور ساجو کے لئے

جن کی خالہ

ان مرحومین کو ڈائن جوگن کے ٹونے ٹوٹکے سے

نہ بچا سکیں۔

ہماری یہ جوگن خالہ

اب خود

مہوے کی شاخ سے ٹوٹ کر

برگ افسانہ بن چکی ہیں ——!

کہانی ہے تو اتنی ہے غریب خواب ہستی کی

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

سیماب

حرف آغاز—

'س'

ترتیب

- غروب سے پہلے ۱۱
- ماجرا ۲۰
- ملنگ باباؤں کی پکنک ۲۹
- سانپ سیڑھی ۳۴
- پانچ مردے ۴۲
- پانی پانی شرم ۴۷
- کرفیو سخت ہے ۵۱
- ترشنا ۵۶
- پشت پہ رکھا آئینہ ۶۹
- شب زاد ۷۴

- کانٹی نیوٹی ۷۹
- نصف بوجھ والا قلی ۸۴
- پہاڑ ٹوٹ رہا ہے ۹۰
- چاہ نشین! فیڈ آوٹ ٹو بلیک ۹۵
- میزبان پانی ۱۰۱
- سوان، سوائن ۱۰۷
- میرے نام کی روٹی ۱۱۵
- نیل کنٹھ کا اصل ۱۱۸
- موَن (मौन) ۱۲۳
- درآید ۱۲۹
- سوکافا ۱۳۸
- پنگا ۱۴۴

غروب سے پہلے

وہ کتاب!

کہاں ہے وہ کتاب؟

کتابوں کے اس ڈھیر میں وہ کتاب

نہیں، وہ ڈھیر میں کھو جانے والی کتاب نہیں۔

وہ کتاب کہیں بھی — کتابوں کے شلف میں، قومی لائبریری میں، کسی ڈرائنگ روم میں، دانشوروں کے تھیلوں میں — کلاس کی میزوں پر، ہر جگہ بالکل ہی الگ سی لگتی ہے۔ وہ ایک ننھی سی کتاب۔ اس عارضی کیمپ میں بھی مہینوں سے وہ اپنے ہونے کا احساس جگائے

ہوئے تھی۔ صبح خیمے سے نکلنے سے قبل یہیں میز پر رکھی ہوی تھی ۔ ایسا بھی کچھ یاد نہیں کہ اسے اٹھا کر شلف میں یا ان پڑھی کتابوں کی قطار میں ڈال دیا ہو اور اس کتاب کو ایسی کسی قطار میں ڈالنا بھی حماقت ہے۔

نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کتاب مجھے پڑھ رہی ہے۔ تل تل مجھے کہیں نہ کہیں سے خالی کرتی جا رہی ہے۔ شاید روپوش ہو کر ایسا کر رہی ہے یا گھل گئی ہے اس مٹی میں جس پر میں کھڑا ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہوا ہو۔ وہ کتاب ملنی ہی چاہئے۔ کہیں وہ کسی اور جگہ نہ چلی جائے۔ یہی چاہتا ہوں کہ وہ کتاب میرے اس خیمے میں ہی دفن ہو جائے اور کوئی اسے یا وہ کسی کو نہ پڑھ سکے۔ جانے کیوں بدلاؤ سے مجھے الرجی ہے۔

''کہیں بدل نہ جاؤں'' یہ سوچ کر بدن میں ایک سہرن سے اٹھتی ہے۔ بدل نہ جاؤ ں یا کوئی مجھے بدل نہ دے۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا میرے بچوں کا۔ ان میں سے تو کوئی ایسی نیو بھی نہیں ڈالی کہ وہ کسی بدلاؤ کو سہار سکیں۔ لوگ کہتے ہیں بیوی اور عورت بہت تیزی سے بدلتی ہے، مگر پوشاک کے بدلنے کو بدلنا نہیں کہتے۔ آخر بدل جانے کا یہ خوف کیوں طاری ہے؟ کیا اس معاملے میں بے خوف اور نڈر نہیں ہوا جا سکتا۔ بدلنے یا بدل جانے کی لڑائی تو چلتی ہی رہتی ہے جیسے زنجیر کی پہلی کڑی دوسری سے اور پھر دوسری تیسری سے اور تیسری چوتھی سے جا ملتی ہے، یہ تو بہت ہی معمولی بات ہے۔ لیکن میری بیوی اسے بہت اہم اور بڑی بات سمجھتی ہے۔ بات معمولی ہی سہی مگر اسے سمجھنا بہت ہی غیر معمولی ہے اور اس غیر معمولی پن کا کوئی شکار ہو جائے تو پھر زندگی نہیں ملتی۔

''تمام الجھاوے کی جڑ یہی کتاب ہے۔ میں اسے جلا دونگی۔'' بیوی کبھی کبھی فیصلہ صادر کرنے کی کوشش کرتی۔

مگر وہ کتاب گئی کہاں؟ یہ میری آنکھوں کو کیا ہوا...... میں اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ پتلیاں آپ ہی کسی غیبی قوت کے زیر اثر حرکت کر رہی ہیں۔ لگتا ہے میری آنکھوں میں جو کچھ بھی پوشیدہ ہے لفظ بن کر ٹپک جائیگا۔ میری آنکھوں کی تنگ بینی کہیں اس کتاب کے اوراق پر ثبت نہ ہو جائے۔ وہ کتاب دھیرے دھیرے میری آنکھوں سے مجھے نچوڑ لے گی۔ اس کے صفحات پر میں ڈھیر ہو جاؤنگا۔ اور شاید یہ کوئی واقعہ بھی نہ بن سکے۔ اہمیتوں کی بھیڑ

میں کتنے ہی ہونگے ایسے واقعات، غیر اہم...... بالکل معمولی......

''کہاں گئی وہ کتاب......!''

''صاحب جی، وہ کتاب......میری کوکھ میں ہے...... سنتے ہو، سنگین کی نوک سے میری پیٹ کو ادھیڑ کر دیکھو......مل جائیگی تمہیں وہ کتاب......''

''یہ کس کی آواز ہے سنتری......کون بول رہی ہے؟''

''کوئی نہیں سر...... پاس والے گاؤں کی ایک عورت ہے۔''

''عورت''

''جی......جی ہاں...... پیٹ میں بچہ ہے سر۔''

''یہاں کیسے آئی''۔

''سر وہ پاس والے گاؤں کی رہنے والی ہے۔ گاؤں جانا چاہتی تھی۔ سو چا چیک کرلوں۔ آج کی رپورٹ کے لئے ایک بھی......''

''تو یہی ملی تھی۔ پھولے پیٹ والی عورت اور پوپلے منہہ والے مرد اچھے نہیں لگتے ۔جانے دے اسے۔''

''مگر سر آج گاؤں میں Combing operation کا آخری دن ہے۔ بہت کچھ برآمد ہونے کا امکان ہے۔ شاید آپکی وہ کتاب''۔

ہاں وہ کتاب تو ملنی ہی چاہئے۔ وہ دھیرے دھیر سب کچھ بول رہی ہے۔ کبھی چھپ کر کبھی سامنے آکر۔ میں اس کے اوراق کتر دینا چاہتا ہوں تاکہ اس کے اوراق بکھر جائیں۔ الفاظ بکھریں گے تو اس کا بے معنی اور بے ربط ہونا لازمی ہو جائیگا۔

''مگر صاحب......میرا ہونے والا بچہ......آج شام تک کیسے رک سکونگی؟ اور پھر یہ جگہ بھی قاعدے کی نہیں''۔

''زیادہ پھس پھس کریگی تو ڈابھ (۱) کی طرح کٹوا دونگا''۔

''ہاں ہاں اٹھاؤ داب (۲) چاک کرو پیٹ، خبردار جو بچے کی گردن کٹی۔''

یہ بچہ کہیں پیدا ہو گیا تو برا ہوگا۔

۱۔ بنگلہ: کچا ہرا ناریل ۲۔ چاپڑ

اسکی پیدائش سے پہلے اس کتاب کا ختم ہو جانا بہت ضروری ہے۔ پیدا ہو کر یہ بچہ ضرور اس کتاب کا سراغ پالے گا۔ اور جب کتاب ہاتھ لگے گی تو اسے پڑھے گا بھی ضرور۔ اور پھر اس کے بعد...... اے عورت کون سا مہینہ چل رہا ہے۔ کب جنے گی بچہ؟

''ڈاکٹر نے بتایا ہے آج ہی کسی وقت یا کل...... ڈاکٹر خانہ ہی سے تو آرہی ہوں۔''

میں قتل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ کتاب اپنے قبضے میں آجائے تو پھر اس بچے کی پیدائش سے بھی کچھ فرق نہیں پڑنے والا۔ مسئلہ اس کتاب کا ہے۔ مگر یہ کتاب ہر مسئلے سے جڑ جاتی ہے۔ آج اس پیدا ہونے والے بچے سے بھی جڑ گئی۔ میری کوئی بھی کوشش اس کتاب کو بچے سے الگ نہیں کر پارہی ہے۔

''کیوں تمہیں بچہ جننے کا بہت شوق ہے؟

''شوق کی ہنڈیا ہمارے چولہے پر نہیں چڑھتی صاحب۔ ضرورت کہو ضرورت۔''

''تب ہی اتنی بے حیائی سے ہونے والے بچے کا اعلان کر رہی ہے۔''

''کیا قیمت رہ گئی ہے حیاداری کی۔''

عورت بولنے لگی۔ کہاں سے سیکھا اس نے بولنا۔ کہیں وہ کتاب۔ میں بھی پاگل ہو رہا ہوں۔ کہاں یہ ان پڑھ عورت اور کہاں کتاب۔ مگر بوڑھے ماما کہتے تھے بیٹا! بدل دینے والی کتاب کے پیر نہیں ہوتے۔ وہ اپنے آپ چلتی ہے۔ لوگ اسے پڑھتے نہیں ہیں۔ وہ خود کو لوگوں سے پڑھوا لیتی ہے۔

''اچھا ریکارڈ کے لئے اپنے شوہر کا نام اور پتہ ہمارے رجسٹر میں درج کروادو۔''

''میں اپنا پتا آپ ہوں۔ میرے نام اور پتے میں شوہر کا کوئی دخل نہیں۔''

''مگر تمہارے پیٹ میں یہ............''

''کہا نہ میں نے کہ ضرورت ...... خیر نوٹ کرو...... سامنے والا گاؤں جہاں تم لوگ مجھے جانے نہیں دینا چاہتے۔''

''اور نام......؟

''کاگلی......''

''بچے کے باپ کا نام......؟

''جنم لینے دو اسے۔ باپ کا نام یہ خود ہی لے آئیگا۔ کھسیا ؤ مت۔
صاحب تم فرض نبھاتے نبھاتے بالکل فرضی ہو چکے ہو۔ کب تک لو گے یہ فرضی سانسیں؟''

یہ عورت نہیں، وہ کتاب بول رہی ہے۔ کہاں سے بول رہی ہے۔ یہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ کچھ لمحوں کے لئے اس کتاب سے غافل ہوا تھا۔ اور اسے غفلت بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس اسے ایک ذرا کھلی میز پر چھوڑ کر باتھ روم چلا گیا تھا۔ کاش کہ اسے کھلی میز پر چھوڑ کر نہ جاتا۔

''میں تمہاری تلاشی لونگا...... سنتری اس عورت کی تلاشی لو۔''

''میں تلاشی دونگی مگر میرا پیٹ کوئی چھو نہیں سکتا۔ میں اپنے بچے کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، سنتری پیٹ کے اوپر کی تلاشی لو۔''

''یہ لو۔ میں نے خود ہی بلاؤز اتار دیئے۔ اب آیا یقین کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

''سالی رانڈ...... چل پہن بلاؤز......!''

''بچہ ہوگا تو بلاؤز کھولنا ہی پڑے گا دودھ پلانے کے لئے۔ اور صاحب تمہارے لئے تو یہ کوئی خاص بات نہیں۔ چونک پڑے ایسے کہ پہلا بلاؤز......''

کس طرح بول رہی ہے یہ عورت۔ بولنے میں کہیں سے بھی پابند نہیں لگتی۔ اوبڑ کھابڑ، ہر طرح کے جملے انڈیلے جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کون سی شئے مجھے اب تک اپنے آپ میں باندھے ہوئی ہے ورنہ مار بوٹوں کے اس کے پیٹ کا بچہ کب کا باہر نکال چکا ہوتا۔ پکے شریفے کے دانے کی طرح۔ سنتری اس کے خاتمے کا کوڈ کئی بار دہرا چکا ہے۔ پر جانے کیوں؟ کوئی شئے حائل ہے درمیان میں۔

''چھاتی پسند آئی؟ آئے بھی کیسے۔ میل جو جمی ہے۔ تم لوگوں کو تو رائفل کے چھروں کی طرح چم چم کرتی چیز چاہئے۔ اس پر تو میل کے ساتھ پسینے کی بو بھی جمی ہے......''

'شٹ اپ'——!

''تو پھر جانے دیجئے' درد بڑھتا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ یہاں تو کسی طرح کا کوئی بندوبست بھی نہیں۔۔ بہت پیاس لگ رہی ہے۔ ڈابھ کا پانی ملے گا—''

''ایک تو غلط ٹائم پر آ کر پریشان کر رکھا ہے اس پر سے ڈابھ کا پانی۔ ماتھا تو نہیں پھر گیا ہے تیرا۔''

''ہمارے گاؤں میں تو ڈابھ کا پانی—'' ''بہت ہے۔'' اگر وہ کتاب نہ ملی تو سارے ناریل گاچھ (۱) جڑ سے کھدوا دونگا۔''

''نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ جب سے تمہاری چھاؤنی اتری ہے' ہمارے گاؤں کا ڈابھ تو تمہارے ہی نیگھ (۲) میں لگ جاتا ہے۔ بہت دنوں سے ڈابھ کا پانی نہیں پیا۔''

''تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑا۔''

''تمہیں چاٹنے کے لئے ایک رات عورت کی ران نہ ملے تو......''

''کتی...... تیری زبان......''

''یہ اوپر کیا لٹک رہا ہے ہرا ہرا۔ بالکل کونچی جیسے دبتے ہی بیچ سے پانی کی دھار پھوٹ پڑے۔ کٹوا کر ایک پلوا دو نا۔ پیاس کے مارے حلق کی نسیں اینٹھ رہی ہیں۔''

''تم ابھی ہماری حراست میں ہو۔ حکم چلانے کی کوشش نہ کرو۔''

''کیا بات ہوئی ہمارے قبضے کی چیز تم لوگ لے لیتے ہو اور اپنے قبضے کا ایک ڈابھ بھی......''

''بک بک کریگی رانڈ......''

''آہ! درد بڑھتا جا رہا ہے۔ سورج ڈوبنے تک شاید میں بچ نہ پاؤں۔ اوہ! کیا ہوگا میرا۔ مجھے جانے دو ورنہ پانی بغیر ہی مر جاؤنگی۔''

''تو زندہ رہے یا مرے، یہ دیکھنا ہمارا کام نہیں۔ تو ہمارے ریکارڈ پر چڑھ گئی۔ ہمارا کام ہو گیا۔''

''مجھے میرے گاؤں جانے دو سورج ڈوبنے سے قبل میرا یہ کام بھی ہو جائیگا۔''

کس کام کی ہے یہ عورت۔ چھاتیاں لٹکی ہوئی، چہرہ مدقوق، پیٹ غبارہ۔ کیا کر سکتی

۱۔ بنگلہ: ناریل کا پیڑ ۲۔ دیہاتی بولی: تصرف میں آنا

ہے یہ۔ اگر میری وہ کتاب نہ کھوگئی ہوتی تو آج کی تلاشی کی مہم ملتوی کرا کرا سکے پیٹ کی صفائی کرا دیتا۔ خود تو شاید زندہ بچ جاتی اور سب کچھ مر جاتا۔ پھر دیکھتا، اسکی زبان پر اگے ہوئے کانٹے کس طرح نرم پڑ جاتے۔

’’My God، سنتری دیکھو خیمے کی طنابیں کیوں ڈھیلی پڑ رہی ہیں۔ یہ لیمپ سر سے کیوں ٹکرا گیا۔ دیکھنا کہیں خون تو نہیں نکلا۔‘‘

’’وہ کیا دیکھے گا تمہارا خون۔ سفید خون بھی نظر آتا ہے؟‘‘

’’حرام زادی! مار بوٹوں کی یہ تیری ٹانگی اڑا دونگا۔ لال خون کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ سب بہہ جائیگا ایک ہی لات میں۔‘‘

’’چلاؤ لات، بہادو سارا خون۔ مگر جنم لینے سے قبل ہی شہید ہونے کی پہلی مثال ہوگی، بے نام شہید، انام شہید۔ یہی موت چاہئے میرے بچے کو۔‘‘

شہادت کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کھوئی ہوئی کتاب میں شاید ایسا بھی کوئی لفظ تھا۔ میری نظر بھی پڑی تھی اس لفظ پر۔ کیا مطلب تھا اس کا۔ تو کیا میں محض لفظوں کو ہی چاٹتا رہا۔ مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ کیا میں واقعی لفظوں کا ہی چٹورا ہوں۔

’’تمہیں کہاں سے ملا یہ شبد...... ہے تمہارے پاس کوئی کتاب؟‘‘

’’اب میں زیادہ دیر تک تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے قابل نہیں رہ جاؤنگی۔ پرندے گھونسلے کی اور روانہ ہو رہے۔ ویسے یہ لفظ تمہاری ہی دین ہے۔ تم نہ ہوتے تو شاید ایسے شبد......‘‘

’’سورج غروب ہونے سے قبل گھونسلوں میں جانے والے پرندے احمق ہوتے ہیں۔‘‘

’’کچھ بھی ہو، انہیں بدھی سے زیادہ گھونسلے عزیز ہیں۔ مجھے اپنے گاؤں جانے دو۔ سورج غروب ہونے میں اب شاید زیادہ دیر نہیں ہے۔‘‘

’’قبل از وقت تمہیں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ تم پرندہ نہیں۔‘‘

’’وہ تو تم بھی نہیں ہو۔‘‘

اس علاقے کے پرندے بلا روک ٹوک ہوا میں لہرانے کے عادی ہیں۔ پرندوں

کے بارے میں بھی کچھ لکھا تھا اس کتاب میں۔ رنگ برنگے پرندے...... سفید۔ سیاہ۔ لال...... انکی اڑان پر الگ الگ بحث تھی۔ مگر کون کس پر سبقت لے جاتا ہے۔ کون کس سے زیادہ اڑان بھرتا ہے یہ تو میں بھول ہی گیا۔ لفظوں کو چاٹنے کی عادت حافظے کو بھی کمزور بنا دیتی ہے۔

''تم نے کبھی کسی پرندے کو ننگی دیوار پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے؟''

''ہاں! کئی بار دیکھا ہے۔''

''کیوں بیٹھتا ہے وہ بے مرمت اور اجڑی ہوئی دیوار پر؟

''تھکا ہوا پرندہ کہیں بھی بیٹھ سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جب بیٹھے تو دانے پر ہی بیٹھے۔ یہ بات کتے نہیں سمجھتے......!''

''کیا......؟''

''ہاں، اب درد نا قابل برداشت ہے۔ خیمے میں اگر کوئی دائی ہوتو......''

''یہ چھاؤنی ہے کوئی نرسنگ ہوم نہیں۔''

''مگر غیر قانونی ڈھنگ سے ایک گربھوتی کو......''

قانون...... یہ لفظ بھی تھا کتاب میں۔ کچھ یاد نہیں پڑ رہا ہے کہاں تھا۔ شاید کونے میں بالکل ٹھٹھرا ہوا جیسے پالا مار گیا ہو۔ مگر کیسے توثیق کروں۔ کہاں گئی وہ کتاب؟ کیسے کھسک گئی میری میز سے؟

''آہ! میرا بچہ۔ پیٹ میں تیزی سے گردش کر رہا ہے۔ یہ میرا پہلا بچہ ہے۔ میں نہیں جانتی کہ بچہ کیسے اس دھرتی پر آتا ہے؟ شدید درد کے بارے میں سنا تھا۔ درد اب شاید انتہا پر ہے۔ چھوڑ دو مجھے...... جانے دو۔''

''دیکھو! اب آسمان کا رنگ بدل رہا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی والا ہے۔ تم شاید زندہ نکل جاؤ یہاں سے۔''

''اگر میرے زندہ بچ نکلنے میں تمہارے رحم وکرم کو ذرا بھی دخل ہو تو میں اس زندگی کو قبول نہیں کرتی۔''

''سور، کتی، حرام زادی...... سنتری اسے۔''

اگر وہ کتاب گم نہ ہوئی ہوتی تو شاید اس دن وہ عورت میرے بوٹوں کی نوک پر نہ ہوتی۔ مگر وہ ڈھیٹ زندہ بچ نکلی۔ شاید بوٹ کی نوک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نہیں! اس کی موت سے پہلے ہی سورج غروب ہو گیا۔ کوم بنگ آپریشن بھی نامکمل رہ گیا۔ اس کے لہو کے دھبے اب بھی قنات پر موجود ہیں۔ ہر دھبے سے جیسے ایک ایک آنکھ تاک رہی ہو اور ہر آنکھ میں جیسے وہ کتاب روشن ہو۔ میں ساری آنکھیں نوچ لونگا۔ ہر دھبے، ہر آنکھ، ہر کتاب کو شوٹ کر دونگا۔ مگر پھر بھی وہ کتاب بچ گئی تو......؟

''......جس کسی کے ہاتھ میں وہ کتاب نظر آئے، شوٹ کرنے کا حکم دیتا ہوں۔''

اس حکم نامے کو بھی پانچ سال بیت گئے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی کتاب نظر نہ آئی۔ کہاں چلی گئی وہ کتاب، کون آیا تھا میرے خیمے میں۔ کیوں چھوڑ گیا تھا میں اسے کھلی میز پر۔

دھائیں!!!

''......کسے شوٹ کر دیا سنتری؟

''ابھی لاتا ہوں سر............''

''ارے یہ تو پانچ سال کے بچے کی لاش ہے۔''

''سامنے والے گاؤں کا ہے۔''

''مگر............''

''گولی ٹھیک مغز پر پڑی۔ جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک انچ بھی ہلا نہیں سر۔!

''یو بلاڈی سوائن...... کیوں ماری گولی اسے؟''

''وہ، وہ اس لئے سر کہ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی......!!!''

☆☆☆

ماجرا

گلی کچھ زیادہ سنسان نہ تھی کیونکہ ابھی ابھی گذرا تھا اس سے ہلدی شاہ۔ رمضان کی پہلی تاریخ سے شروع ہو جاتا ہے ہلدی شاہ۔ ''روزے داروں کا چمکا ستارہ آیا رمضان پیارا ہمارا''۔ اور پھر چاند رات کو۔ ''چلا رمضان پیارا ہمارا۔'' یہی بول ملے تھے اسے وراثت میں ۔پہلی گنگناہٹ سے ساٹھویں گنگناہٹ تک۔ یہی بول۔۔ یہی لے۔۔ یہی دھن۔ سوئے ہوئے کو جگانا اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ اسکی ڈفلی، اسکے بول، اسکی لے، اسکی دھن۔ سب کے سب جاگنے والوں کے لئے بس بہانے کی طرح تھے۔ ورنہ روزہ دار سحری کے وقت جاگتے ہی ہیں جس طرح فلیٹوں میں اٹھونا دودھ، اخبار اور انڈے پہنچانے والوں کو لوگ مہینوں نہیں

دیکھتے۔ اسی طرح ہلدی شاہ کو بیشتر روزہ دار مہینہ بھر نہیں دیکھ پاتے کیونکہ ہلدی شاہ اگر مندر اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر ڈفلی بجاتا ہے تو اسکی گونج ذکریا اسٹریٹ کے سونے والوں کو جگاتی ہے۔ بچپن سے ابتک اس نے ان گلیوں میں زیادہ بدلاؤ نہیں دیکھا۔ بہت پہلے اس نے سنا تھا کہ آزادی ملی تھی اور پھر اس کے کچھ ہی برسوں بعد ان محلوں میں ٹرک داروں کا غلبہ ہو گیا۔ اور جیسے سارا علاقہ گیرج بن گیا ہو۔ جب کارپوریشن کی بتیاں سڑکوں پر اندھیرے پھیلا دیتی ہیں تو اسے کتنا ڈر لگتا ہے۔ اگر اللہ کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ سحری نہ جگاتا۔ ٹرک داروں نے آکر تہذیبی سطح پر بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ البتہ محلے کے گراؤنڈ فلور کی تہذیب ایک ذرا متاثر ہوئی تھی۔ جوکر اور ستوں نے اب اپنے پنجوں میں استرے داب لئے تھے۔ سکنڈ، تھرڈ، فلور والوں کے پیٹ استروں کی زد میں ہیں۔ سنا جاتا ہے اب جب وہ نیچے اترتے ہیں تو اپنے پیٹ پر انگلیاں پھیر کر ضرور دیکھ لیتے ہیں ممکن ہے چار چپاتیوں کی زیادتی نے پیٹ کو پنٹ کے گھیرے سے ۲ انچ باہر کر دیا ہو۔ اور گھیرے سے باہر آیا ہوا پیٹ استروں کے لئے بے حد مناسب ہوتا ہے۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ گلی سنسان نہ تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ گلیاں سنسان نہیں ہو سکتیں کہ وہ اس صفت سے محروم ہو چکی ہیں۔

ہلدی شاہ کے گذرتے ہی کوٹھیوں سے سیڑھی چڑھنے اور اترنے کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چمچے اور پیالیوں کی کھنک سنائی پڑنے لگتی ہے۔ لوگ آدھے جگے، آدھے سوئے سحری کھانے میں جٹ جاتے ہیں۔ اس گلی سے کچھ ہی فاصلے پر رات بھر کھلے رہنے والے ہوٹل بھی ہیں۔ بیشتر بے گھر روزہ دار ہوٹل کی جانب جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کارپوریشن کے نل سے پانی بھی چونے لگتا ہے۔

ہلدی شاہ کی صدا کے ساتھ ہی لوگ اکادکا نیچے آنے لگے۔ ایک شخص سامنے والی کوٹھی سے نیچے آیا اور کارپوریشن کے نل سے چلو بھر بھر کر پانی پینے لگا۔ ممکن ہے پہلے ہی سے فرنی کھا رکھی ہو اور صرف پانی پینے کے لئے ہی نیچے اترا ہو۔ اس کے بھورے چہرے پر بنتے مٹتے نقوش اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ کسی سنگین مسلئے سے دوچار ہے۔ شاید اس نے فیرنی کھائی ہی نہ ہو۔ اس کا پانی پینے کا انداز بھی کچھ عجیب سا تھا۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر آسمان بھی تاک لیتا تھا۔ اور پھر منہہ نیچے کر کے پانی پینے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ کارپوریشن کے نل

کے قریب ہی ایک اور بڑی عمارت تھی۔ اس بڑی عمارت اور ٹرک داروں کے دفتر کے درمیان والی گلی وہیں سے مڑتی تھی۔ اگر کوئی شخص اس گلی میں مڑ جائے تو شاید کارپوریشن کے نل کے پاس کھڑا آدمی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ آدمی پانی پی کر وہیں کھڑا ہے۔ شاید وہ ٹھہر ٹھہر کر پانی پینے کا عادی ہے۔ کیونکہ اوک سے لگاتار پانی پینے کا عمل نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر زیادہ قریب سے دیکھا جائے تو شاید وہ آدمی پراسرار بھی لگنے لگے۔ اس کے تاثرات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر کوئی راز دبا ہو۔ اور اسکی حفاظت اسکے لئے ایک اہم مسئلہ۔ کیونکہ وہ محض پانی پینے کے لئے کوٹھی سے اترا ہوتا تو پانی پی کر لوٹ گیا ہوتا۔ وہ اب تک وہاں بلاوجہ ہی رکا تھا۔ شاید لاسمتی کا شکار ہو یا پھر کوٹھی میں اس کا کوئی گھر نہ تھا۔ جہاں جانے کے بارے میں وہ سوچ سکتا۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جنکے جانے کے لئے کوئی مقررہ جگہہ نہیں ہوتی۔ کوئی گھر نہیں ہوتا جہاں ہنگر سے ٹنگے کپڑے اس کے منتظر ہوں۔ جہاں سونے کے لئے خالی بستر اس کا منتظر ہو۔ اور بیوی۔ ممکن ہے اس کا سب کچھ ہو مگر بیوی کسی موٹر میکانک کے ساتھ۔ مگر یہ بات سرے سے غائب ہی ہوگئی کہ عید آیا ہی چاہتی ہے۔ اور وہ عید کی تیاریوں پر ہونے والے اخراجات کے بارے میں سوچ سوچ کر مضمحل ہو۔ اکثر عید پیسے جوڑتے جوڑتے آگے کھسک جاتی ہے۔ اور پھر قربانی کا مہینہ، پھر محرم، پھر چالیسواں اور سب کچھ ختم۔ اسکے بعد سوچ کی رائی سوچ کا پربت۔

اسکی سوچ کا عمل جاری ہی تھا کہ حادثہ ہو گیا۔ ایک لمبا سا آدمی بڑی تیزی سے اس کے آگے سے بھاگتا ہوا نکل گیا۔ اسکے دونوں ہاتھ اسکی جیبوں میں چھپے تھے۔ چند سکنڈ بعد ہی اچانک سامنے کے دروازے سے چھلانگ لگاتا ہوا ایک اور آدمی جو ٹیری ٹاول گنجی اور جنس کا پتلون پہنے ہوا تھا، نمودار ہوا اور لپک کر اس کالے آدمی کی گردن دبوچ لی۔ کالے آدمی نے ایک جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس سے قبل کہ وہ بھاگتا اسکے پیٹ میں استرا گھوم چکا تھا۔ ”سالا سور کا بچہ۔ ہم سے ٹول گیری۔ بھڑوا لوگ کا ناف پر قلم چلانا دو انگلی کا کام ہے بیٹا“ کالا آدمی بڑی خاموشی سے فٹ پاتھ پر تہ بتہ بیٹھتا چلا گیا۔ وہ شخص نل پر کھڑا یہ منظر گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹیری ٹاول گنجی والا شخص اسکی طرف مڑا اور بولا۔

”کا بے چھنڈک! چل پھوٹ۔“ —— فٹ پاتھ پر ڈھیر شخص کے منہہ سے ایک آہ نکلی۔

وہ ساکت کھڑا اس کالے لمبے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ اور شاید یہ سوچ رہا تھا اس پیٹ کے بارے میں جو استرے کی زد میں تھا۔ اپنی تہذیب کی بے بس اور لاچار گردن کے بارے میں جو استرے کے نیچے تھی۔ چند لمحوں کے انترال کے بعد اسکی استعجابی کیفیت دور ہوئی۔ وہ نیم خوابی کی سی کیفیت میں اس فٹ پاتھ پر ڈھیر لمبے کالے آدمی کی طرف بڑھا۔ اس آدمی کی آنکھیں اس طرح تنگ گئی تھیں جیسے وہ متواتر کسی کو گھورے جا رہی ہوں۔ اسے بھی ایسا لگا کہ اسکی مردہ آنکھیں اسے ایک ٹک نہار رہی تھیں۔

"کیا ہوا بھائی۔ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟ ایک شخص لنگی بنیائن میں ملبوس دھمکی آمیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

بس یوں ہوا کہ یہ شخص میرے سامنے سے گذرا۔ اس کے پیچھے ٹیری ٹاول گنجی پہنے ایک شخص لپکا اور اسکی گردن دبوچ لی اور بولا "سالا سور کا بچہ ہم سے ٹول گیری۔ بھڑوا لوگ کا ناف پر قلم چلانا دوانگلی کا کام ہے بیٹا"۔ اور کچ سے استرا پیٹ میں۔

اور پھر مجھ سے بولا۔ "ماسٹر لوگ کا قلم کا کالی نیلا ہو بے ہے۔ ہم لوگ کا قلم لال کالی سے نہا بے ہے۔ کیا سمجھے۔" اس کے بعد ایک نظر مجھ پر ڈالی اور فرار ہو گیا۔ سامنے والی گلی میں مڑ گیا ادھر یہ بے چارہ دم توڑ چکا تھا۔

کیا ہوا؟ -- ایک موٹا آدمی پان کی دکان کی جانب سے دوڑتا سڑک پار کرتے ہوئے چلایا ——— "قتل! قتل ہو گیا ہے۔" سامنے کھڑے ہوئے شخص نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔" فٹ پاتھ کے دوسرے سرے پر چلتے ہوئے آدمی نے اطلاع دی۔

"کیسے ہوا یہ سب" اس موٹے آدمی نے بڑی ملائمیت سے پوچھا۔ اس دوران تین چار آدمی اور کچھ بچے بھی اکٹھا ہو گئے تھے۔ ساید سحری کے لئے دھیرے دھیرے سارا محلہ جاگ پڑا تھا۔ ایک دو کے ہاتھ میں لوٹا بھی تھا ٹونٹی والا۔ ممکن ہے نل سے پانی بھرنے آئے ہوں۔ سب کے سب اکٹھا ہو کر لاش دیکھنے لگے۔

اس وقت وہ شخص خود کو بہت important تصور کر رہا تھا۔ کیونکہ جیسے ہی اس نے اپنا بیان شروع کیا ویسے ہی سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اس نے کم وبیش وہی بیان دہرایا۔ اس دوران تقریباً ساٹھ ستر آدمی جمع ہو چکے تھے۔

کیا ہوا۔ آنے والوں ہی میں سے ایک نے سوال کیا۔

''میں نل کے پاس پانی پی کر کھڑا تھا۔'' اس بار اس نے اپنا بیان گرجدار آواز میں شروع کیا۔ کیونکہ اسے اس بات کا احساس تھا کہ سب کی نگاہیں صرف اسی پر مرکوز ہیں۔ بیان جاری رکھتے ہوئے بولا ——— ''اور یہ آدمی میرے سامنے سے بھاگتا ہوا ———''

''سنو برخوردار! ———'' ایک بونا سا بدشکل آدمی اسکی کہنی تھپتھپاتے ہوئے بولا ——— ''تم گھر کیوں نہیں چلے جاتے اور ہاں یہ کہ تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کچھ بھی نہیں سمجھے۔''

''نہیں نہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' وہ مٹھی ہوا میں لہرا لہرا کر بولنے لگا جیسے اپنی بات کی صداقت پر مصر ہو۔ پھر وہ سڑک پر ٹھیک اسی طرح کودا جیسے وہ ٹیری ٹاول گنجی والا شخص کودا تھا۔ اس طرح اس نے سچ ثابت کرنے کے لئے اپنے گھٹنے لہولہان کر لئے۔ مگر وہ رکا نہیں۔ اس نے اپنا بیان جاری رکھا۔ پھر درمیان میں یہ آواز ابھری۔

''تم گھر کیوں نہیں جاتے، ارے بھائی بیکار اس معاملے میں پڑے ہو۔ روز ہی ہوتا ہے یہ سب اس محلے میں۔ جاؤ گھر جاؤ۔ کیوں خواہ مخواہ پھنسنا چاہتے ہو۔ روزے رمضان کا دن ہے۔''

اس نے اس ناٹے آدمی کو حقارت سے تاکا۔ شاید اس لئے کہ وہ روزے رمضان کی بات کہکر اسے حقیقت بیانی سے باز رکھنا چاہتا ہے۔

پھر کیا ہوا؟ بھیڑ سے ایک آواز آئی ——— پھر ——— اس بار نہیں بچو گے اور چھرا سے استرا پیٹ میں۔ اور پھر مجھ سے بولا ——— ''ماسٹر لوگ کا قلم کا کالی بولو ہوبے ہے۔ ہم لوگ کا قلم لال کالی سے نہابے ہے ——— کیا سمجھے'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا اور فرار ہو گیا۔ سامنے والی اس گلی میں مڑ گیا اور اس طرح یہ بیچارہ لمبودم توڑ چکا تھا۔

''ایک بہی خواہ کی حیثیت سے میں تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ تم گھر چلے جاؤ۔ تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا ———'' یہ الفاظ پھر اس کے کانوں کے پاس گولی کی طرح سنسنائے مگر بھیڑ سے ایک اور آواز ابھری ———

کیسے ہوا سب کچھ؟ اب تک تو کافی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ ہر شخص کی نظر واقعی اس پر

مرکوز تھی۔ وہ کتنا اہم بن چکا تھا۔ شاید اس کا اندازہ اسکے گھر والے بھی نہ لگا سکیں۔ کہیں وہ آنکھ کھلی نہ رکھتا اور یہ سب نہ دیکھتا تو اس وقت اسکی بھی حیثیت انہی بھیڑ میں گم لوگوں کی ہوتی۔ کس قدر محتاج ہوتا وہ اس شخص کا جس نے یہ واقعہ کھلی آنکھوں سے دیکھا ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ محتاج نہیں اسکی آنکھیں کھلی ہیں۔ اور ہر شخص اسکے جواب کا منتظر ہے۔ کہاں زندگی میں اسے سننے والے دو یا تین سے زیادہ کبھی میسر نہ تھے اور کہاں یہ جم غفیر۔ یہ محتاج مجمع — کاش اسکی بیوی نے یہ منظر دیکھا ہوتا —— ''میں نل کے پاس پانی پی کر کھڑا تھا۔'' وہ پھر ایک طرحدار مقرر کی طرح شروع ہوا۔ ''میں نل کے پاس پانی پی کر کھڑا تھا اور یہ بیچارہ۔''

''کیا کر رہے ہو یہ سب۔ تمہیں کیا ملے گا یہ سب کہہ کے۔ پریشانی —'' اس بد شکل اور بونے آدمی نے اسے پھر ٹوکا۔ مگر وہ اسکی پروا کیئے بغیر بولتا ہی رہا۔

یہ شخص میرے سامنے سے بھاگا۔ اسکے پیچھے ٹیری ٹاول گنجی میں ملبوس ایک شخص لپکا اور اسکی گردن دبوچ لی اور بولا —— ''سالا سور کا بچہ ہم سے ٹول گیری۔ بھڑوا لوگ کا ناف پر قلم چلانا میرا دو انگلی کا کام ہے'' اور پھر کچ سے استرا پیٹ میں — دھیرے دھیرے یہ فٹ پاتھ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں قریب پہنچا تو دیکھا کہ بیچارہ دم توڑ چکا تھا۔

اس بار بولتے بولتے اسکی نسیں ابھر آئی تھیں۔ وہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ آنکھ ناک سب سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ بلا عادت اتنی بڑی بھیڑ کو چیخ چیخ کر سب کچھ بتانا محنت طلب بات تھی۔ اسکی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اتنی بڑی بھیڑ کو خطاب کرنا آسان نہ تھا مگر — مگر وہ کتنا کامیاب ہے آج۔ سب ہی اسکی بات کو ماننے کے لئے آمادہ ہیں۔ ابھی وہ اپنی اس عظیم الشان کامیابی سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ اسکے کان میں پھر وہی آواز ابھری۔

''تم جو کوئی بھی ہو۔ مگر ہو احمق۔ میری بات مانو — خدا حافظ۔'' اور وہ بدشکل ناٹا آدمی بھیڑ کو ہٹاتا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بھیانک چہرے والا شخص نمودار ہوا۔ اس نے اسے بازو سے پکڑا اور بولا۔ ''کیا تم نے واقعی سب کچھ دیکھا ہے۔''

دیکھا ہے کیا بات کرتے ہو۔ وہ مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

ہاں تو کیا دیکھا تھا؟

''میں نل پر پانی پی کر کھڑا تھا کہ یہ شخص میرے سامنے سے بھاگا اس کے پیچھے

——اور پھر کھچ سے استر ا اسکے پیٹ میں -- میں قریب پہنچا تو یہ شخص دم توڑ چکا تھا"۔

بھیانک شکل والے آدمی نے اسکے بیان کو غور سے سنا اور پھر پوچھ تاچھ شروع کی۔

سچ سچ تم نے قاتل کو بہت قریب سے دیکھا تھا؟

ہاں—تمہاری شکل سے ملتا جلتا

کیا تم اسے دیکھ کر پہچان سکتے ہو؟

بالکل، کیوں نہیں!

بہت اچھا!

پھر وہ خوفناک چہرے والا آدمی اسے کھینچتا ہوا افسر اعلیٰ کے دفتر لے گیا۔

"اطمینان رکھو، ہم تمہیں کسی طرح کی تکلیف میں مبتلا نہیں ہونے دیں گے۔ کام صرف اتنا ہے کہ جب قاتل پکڑ لیا جائے گا تو تمہیں اسکی شناخت کرنی ہوگی بس!"

اور پھر نہ جانے وہ کتنی بار شناخت کے لئے بلایا گیا اور مایوس لوٹایا گیا۔ مطلوب مجرم ان پکڑے جانے والوں میں ہوتا ہی نہیں۔ اس کے سامنے No کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ٹیری ٹاول گنجی والا شخص جیسے کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔ ایک بار اس نے سوچا بھی کہ کسی غلط آدمی کو پہچان لیا جائے اور نکل جایا جائے۔ اس حوالات سے۔ عید سر پر کھڑی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکا۔ ہاں وہ اتنا ضرور کر سکا کہ حوالات کے کرم فرماؤں سے منتیں کیں کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ مگر اس کا باہر جانا خطرناک تھا اسکی اپنی زندگی کے لئے کہ استرے والے مخالف کے گواہ کو قطعی برداشت نہیں کر سکتے لہذا پکڑ میں نہ آنے والے قاتل کا انتظار اسکے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ معلوم نہیں اسکی حیثیت کیا کیا تھی۔ باپ تھا۔ شوہر تھا۔ کنبے کا سربراہ تھا۔ آنے والی عید کی اس پر کیا کیا ذمہ داریاں تھیں۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے اگر... قانون کی مدد کرتے بال بچوں کے درمیان سے شوہر یا باپ غائب ہو جائے۔ کنبے کا سربراہ گم ہو جائے ۔۔ مگر وہ گم ہونا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ ان دنوں اپنی بیوی کے معاملے میں بے یقینی کا شکار تھا۔ ممکن ہے اسکی غیر موجودگی کے باوجود عید کی ساری خوشیاں، ۔ سلاخوں کے اس پار بالکل سامنے کھڑی ہوں۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم واحد آدمی ہو جو سارا ماجرا من وعن بیان کر سکتا ہے۔ چشم دید گواہ ہی تو جان ہوتا ہے ساری کاروائی کی۔ تمہارے بغیر کاروائی آگے نہیں بڑھ

سکتی۔ تم نے تو دیکھا ہے اسے۔ وہ استرا بھی دیکھا ہے۔ چمچماتا ہوا۔ تمہاری آنکھوں میں بھی اسے چمچماتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ یہ استرے سب کچھ کاٹ دیں گے۔ ناک، کان، پیٹ، آنت ۔۔ سب کچھ تم ہمارے لئے بہت اہم ہو۔ اگر وہ پکڑا گیا، جو صرف تمہاری وجہ سے ہی ہوگا۔ تو ہم سب استرے سے بچ جائیں گے۔ ورنہ پھر گھروں میں آدمی نہیں، استرے چلیں گے۔"

راتوں رات وہ کتنا اہم ہو گیا تھا۔

پچھلی عید کی اداسی کارپوریشن کے نل پر صاف دکھائی پڑ رہی تھی۔ اس نل کے پاس آتے ہی اسے سارا ماجرا یاد آنے لگتا۔ اپنے اہم ہونے کا۔ گذشتہ سال سحری کے وقت وہ آیا تھا اس نل کے پاس۔ مگر لوٹ نہ سکا وحید اس کا سارا گھر سمیٹ لے گئی۔ موٹر میکانک نے سب کچھ بھر لیا اپنے جھولے میں۔ اب اسکی زندگی بالکل خالی تھی۔ اس نل کے پانی کے سوائے کیا بچا تھا اسکی زندگی میں۔ پھر عید آنے والی ہے۔ تھوڑی دیر میں پھر گذرے گا ہلدی شاہ گاتا ہوا ——— "روزہ داروں کا چمکا ستارا۔" مگر اس سے قبل کہ ہلدی شاہ کی آواز ابھرے، ایک زور دار کریش کے ساتھ تیزی سے آتا ہوا ٹرک بالکل نل کے سامنے جہاں وہ کھڑا تھا، فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ اگر وہ کود کر ایک طرف نہ ہوتا تو شاید وہ بھی ......

"چل بے سامنے کھڑا کیا منہ تکتا ہے۔ پہچانتا نہیں کہ کس کی گاڑی ہے۔ جلدی کر دھکا لگا۔" ٹرک دھکے کھا کر چلنے لگا۔ مگر چھوڑ گیا اپنے پہیوں سے کچلی تین لاشیں۔ کریش کی آواز سے لوگ جاگ پڑے تھے۔ ہلدی شاہ کے آنے سے پہلے ہی لوگ جائے حادثہ پر پہنچ چکے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ اسکی کمر پر تھے۔ جیسے وہ کچھ بولنا چاہتا ہو۔

"ارے بھائی تم تو ساری ساری رات اس نل کے پاس کھڑے رہتے ہو۔ کیا نمبر تھا اس ٹرک کا۔ کدھر غائب ہو گیا وہ ٹرک۔" ہر شخص کی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں کیونکہ وہی ساری رات جاگتا ہے۔ اسی نے یہ حادثہ دیکھا ہے۔ جاگنے والا ہی سچ بات جانتا ہے۔ وہی سب کچھ بتا سکتا ہے۔

"ہاں بولو۔ جلدی کرو۔ پولیس میں رپورٹ درج کرانی ہوگی۔ جلدی بتاؤ۔ کیسے ہوا یہ سب؟ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے سب کچھ، بتاؤ...... بتاؤ......"

"خاموش ہو جاؤ......" وہ چیخا!

پھر مجمع پر گہری خاموشی چھا گئی...... وہ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ گردن چاروں طرف گھمائی۔ زبردست مجمع تھا۔ لاشیں بھی تو تین تھیں۔ لوگ بڑی بے صبری سے اسکی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کود کرنل کے پاس بنے پشتے پر چڑھ گیا اور چیخ کر بولا......

''نہیں...... میں نے کچھ نہیں دیکھا......!!!''

☆☆☆

ملنگ باباؤں کی پکنک

سنسان اور ٹھٹھرے ہوئے شہر کے چند رایلٹ ملنگ باباؤں نے الگ الگ اور مل جل کر ایک ہی فیصلہ کیا۔

پکنک منانے کا

پکنک...... باباؤ تم پکنک پر کیوں جاتے ہو؟

کیوں......؟

کیونکہ جب گھر کی آرام کرسیاں کھٹمل بن جاتی ہیں تو ہم پکنک اسپاٹ کی طرف بھاگتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ معلوم نہیں اور شاید کوئی بتانے والا بھی نہیں کہ ہمارے مقبروں کی آرام

کرسیاں کس طرح اپنی ٹانگوں پر کھڑی ہو کر آتے جاتے کتوں پر بھونک سکتی ہیں۔

پکنک اسپاٹ!

شہر سے دور! بہت دور...... ریت ہی ریت پھیلی تھی وہاں۔ ریت کو کاٹ کاٹ کر، بانٹ بانٹ کر، تراش تراش کر ایٹم بنانے کا سنگین مسئلہ تھا پچھلی صدی کا۔ ایٹم کو جوڑ جوڑ کر ریت بنانا بالکل ہی تازہ مسئلہ ہے۔ اسی لمحے کا مسئلہ ہے۔ لمحے پھیلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ادھر معصوم بھکشوؤں کے بیچ اپرادھوں کا نیلام ہو رہا ہے۔ بھکشوؤں کو بھیک چاہے۔

بھیک۔ بھیک۔ بھیک ہمیں بھیک دو۔ بھیک چاہئے ہمیں، خاموش! اپنے پیشے کے ناخلف وکیلو۔ کیا خاموش نہیں رہ سکتے۔ اپنی یہ توتلی زبانیںAIR BAG میں نہیں ڈال سکتے۔ کم از کم تمہارے توتلے پن کو ایک پرواز تو ملے گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ — کالے ناگ— اور سفید کوئے فضاؤں پر مسلط ہیں اور انکے پنجوں کے نیچے مردہ ناخنوں کی ایک موٹی دیوار اٹھ رہی ہے اور تم سب! یعنی تمہاری انگلیاں ایک دن ان مردہ ناخنوں سے جوڑ دی جائیں گی۔ کیا ہوگا تب۔ پھر دیکھ سکو گے۔۔ اونٹ کے قدموں کے نشان تلے دبی اپنی انگلیاں؟ کالے اور سفید کوے ببول کی شاخوں کو پنجوں پر گن رہے ہیں۔ اونٹ مسافر ہے، سفر کے ساتھ جاتا ہے۔

چھوڑ جاتا ہے کھروں کے داغ......

کہاں......

اپنے پیچھے......

جہاں......

صرف ریت ریت اور ریت ہی ریت ہے

پکنک اسپاٹ پر ملنگ باباؤں کا اجتماع......

چاروں طرف۔

ریت ریت اور ریت ہی ریت

ایک ملنگ بابا نے اپنے کاندھے پر گدھ بیٹھا رکھا ہے۔ وہ اپنی پتلی نحیف انگلیوں سے گدھ کے پروں کو شانہ کر رہا ہے۔ دور جلی ہوئی ببول کی شاخ سے خبروں کا ایک خصوصی

BULLETIN پڑھا جارہا ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر میں دبی پہلی خاتون نے سب کچھ تحس نحس کردینے کی گھوشنا کی ہے۔

ایک سپاہی کے رائفل میں لگی انی آوارہ ہوکر بلا امتیاز آدمی اور جانوروں کے پیٹوں کو پھاڑ رہی ہے۔ کتے خون پی کر سڑکوں پر بدمست ہورہے ہیں۔ بازار سے تمام حفاظتی بیلٹ غائب پائے گئے ہیں۔ معتبر ذرائع سے یہ خبر ملی ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں معلوم ہوا ہے کہ شہر کے کچھ ملنگ بابا پکنک منانے کی غرض سے ریگستانوں کی جانب نکل پڑے ہیں اور شاید ان کا قافلہ ریت محل کے آس پاس ہی خیمہ زن ہوا ہے۔ ہم تمام شہری پکنک کی کامیابی کی کامنا کرتے ہیں اور انہیں ان کی مہم پسندی کے لئے مبارکباد دیتے ہیں۔

دوسرا ملنگ بابا آنکھ بند کئے سگریٹ کی راکھ کو اپنی ننگی کمر پر مل رہا ہے

کون آگیا ہمارے پکنک میں............؟

گانجا ہے تمہارے پاس.........؟

اجنبی اپنی جیب سے افیون باہر کرو...........؟

تمہارے تھیلے میں عورت کی ڈمی ہے..........؟

ہاں ہاں لٹاؤ اسے! ہم اس کا ریپ کریں گے۔

نکالو.......... جلدی کرو۔

آج پکنک میں کچھ بھی نہیں۔

ہے کیوں نہیں۔ آج ہمارے ڈبوں میں بند ہے بھنی ہوئی وہی عورت.........

ارے ہاں ہاں اس بار تو تمہاری ماں کی باری تھی۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے۔ بہت مزیدار ہوگی وہ تو۔ دیکھنے میں کتنی گوری، چٹی گداز اور کم عمر تھی وہ۔

نمبر ۵ تم اپنا ڈبہ کھولو۔ دیکھو کھوپڑی اور مغز۔

نمبر ۶ تمہارے ڈبے میں کیا ہے........ ماں کی چھاتیاں

نمبر ۷.......... ران کا نرم نرم گوشت

نمبر ۸......... پنڈلیاں

بس بس! دیکھ لیا۔ تمہارے قبضے میں بھنی ہوئی ماں کے جسم کے لذیذ ٹکڑے ہیں۔

پکنک میں جب آئے ہو اجنبی تو تم بھی کچھ مانگ لو۔ ہم کچھ SPARE کر سکتے ہیں۔ مانگ لو۔ ورنہ ریت پھانک کر مر جاؤ گے

''تو پھر تم دے سکتے ہو تو ماں کی کوکھ دیدو۔''

''یہ کیا شئے ہے'' (سب ملنگ بابا ایک ساتھ)

''ہے ایک شئے''۔

''وہ شئے ہے تمہارے پاس؟

نہیں۔!

دکھاؤ............!

نہیں۔نہیں!

دیکھو اجنبی ملنگ باباؤں کے تعاقب کو تمہاری رفتار برداشت نہں کر سکتی۔ وہ ڈبہ ہمارے حوالے کردو۔

مر سکتا ہوں............ وہ ڈبہ نہیں دے سکتا۔

آؤ ہم سب اس اجنبی کے لئے سزا تجویز کریں

ہم سب اسکے گرم لہو سے اشنان کریں گے

CONSENSUS

ٹھیک ہے ٹھیک، پکڑ لو

(اجنبی ریت پر پھسلتا ہے۔ تھیلا اور ڈبہ دور گرتا ہے)

سلاخ لاؤ۔ ڈاکٹر بابا اجنبی کے دل کی نشاندہی کرو۔

سلاخ مجھے ہی دیدو۔ میں اس کے دل میں اتار دوں، لاؤ۔

(گرم لہو سے اشنان ختم ہوا)

ڈبہ کہاں ہے۔؟

پہلے وہ تھیلا کہاں ہے؟

آؤ ہم سب ریت کو الٹ پلٹ کر دیکھیں۔

مل گیا۔ مل گیا۔ مل گیا

(بلند قہقہے)

گرم لہو سے اشنان کرنے والے سب ناپاک ہیں ۔ میں نے اسکے لہوں کی ٹھنڈک سے اشنان کیا ہے۔ اس لئے اس ڈبے کو کھولنے کا حق صرف میرا ہے۔ یہ حق مجھے دیا جاے

CONSENSUS

ہاں ہاں جلدی کھولو، واہ انوکھی شئے اسی ڈبہ میں بند ہے۔

ڈبہ کھلتا ہے اور اس سے ریت اڑ کر باباؤں کی آنکھوں میں گھس پڑتی ہے۔

ریت ریت اور ریت ہی ریت

اندھے ملنگ باباؤں کا قافلہ شہر کی جانب روانہ ہو چکا ہے۔ ببول کی جلی شاخ پر رکا گدھ انہیں ۸۰ اسّی کوس تک جاتا دیکھتا رہے گا۔

☆☆☆

سانپ سیڑھی

آپ سب میری لکھی ہوئی کہانی سننے کو بے قرار ہیں —— مشتاق بھی ہیں —— لیکن کہانی اور آپ کے درمیان ایک سیڑھی حائل ہوگئی ہے۔ تو پہلے اس سیڑھی کا بیان ہوجائے ——

عجیب وحشت ناک سیڑھی ہے —— پیر دھرا نہیں کہ ایک نامعلوم بلندی کی طرف لیکر روانہ —— اور اگر کوئی الٹا بٹن دب جائے تو ایسی گہرائی میں لیکر اترے کہ آدمی بے نام و نشان ہوجائے —— اسکی کہانی میں آپکو اس تمہید کے بعد سنانے والا ہوں —— اس کے پوروجوں نے اسی سیڑھی پر پاؤں رکھے تھے —— اور پھر کبھی نہیں لوٹے —— جہاں سے

وہ جانتی ہے، اسکے دادا کا بھی حشر یہی ہوا۔ اور باپ بھی اس سیڑھی پر سوار ہوکر تحلیل ہوگیا۔ اور ماں اسکے باپ کے گھر سے کسی دوسرے گھر میں اٹھ گئی۔ الغرض جب جب سیڑھی پر ان کے پاؤں آئے —— بٹن الٹا ہی دبا ——

وہ جسکی کہانی چند لمحوں میں ہی آپ سنیں گے اس سیڑھی پر پاؤں دھرنا نہیں چاہتی تھی۔ سیڑھی اب بھی چمک رہی تھی مگر اس فرق کے ساتھ کہ اس چمک میں اسکے پورو جوں کے لہو کی چمک بھی شامل تھی۔ مگر وہ کرتی بھی کیا کہ پچھلے مہینے ہی چاچا نے اسکی دیدی کو ان سیڑھیوں پر سوار کر دیا تھا۔ اور وہ بہت دیر تک اسے تہ بہ تہ دھنستے اور غائب ہوتے دیکھ رہی تھی —— چاچا کی آنکھوں میں جیسے تنکے ٹوٹ رہے تھے۔ انگلیاں پٹ پٹ کر رہی تھیں۔ مگر دیدی —— اس کی دیدی بے احساس ہونٹوں پر لاچار چپ لئے پرکھوں کی طرح سیڑھی پر سوار ہوئی۔ اور کٹ! کٹ! باندھنے والے جو لمبے دھاگے تھے سب ٹوٹ گئے۔ اس کے قبل کہ کہانی شروع ہو —— دیکھا جائے کہ کب آئی تھی یہ سیڑھی اس گاؤں میں —— کس شہر میں بنی تھی یہ —— کس نے اس کا استعمال سب سے پہلے کیا تھا —— کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم —— ہاں اتنا ضرور بتایا جاتا ہے اور شاید اتنا ہی معلوم بھی ہے (اور چھپانے سے بھی کیا حاصل) جب گاؤں میں اکال پڑتا، کیڑے مکوڑے مانند چھوڑ دیتے، آدمی اپنے کو خالی پاتا —— پیٹ کا بلاڈر ہوا پانی سے پھول کر پھٹنے لگتا تو سیڑھی نمودار ہوتی۔ خالی پیٹوں والے اس پر سوار ہو جاتے اور پھر کبھی نہیں آتے۔ دو چار روز سے اس کا بھی پیٹ خالی تھا۔ جوں جوں اسکے پیٹ کا خالی پن بڑھتا، سیڑھی اسکی آنکھوں میں زور زور سے چمکنے لگتی —— سیڑھی پہ پاؤں دھرا نہیں کہ سارے منظر غائب۔ اسکی سہیلیاں، اسکے گڈے، اسکی گڑیا، ننھی سی ڈولی، ماٹی کے گھوڑے، کاٹھ کا ہاتھی —— کاغذ کے براتی —— پلاسٹک کے کہار۔ الٹا بٹن دبا اور سب کچھ غائب۔ اس کے باپ نے اس کو خبردار کیا تھا ——

"اس سیڑھی کے موہ میں مت پڑنا۔" پھر بھی وہ خود اس سے نہ بچ سکا، گرچہ اسے یہ امید تھی کہ بیٹوں کے سیانے ہونے تک اس سیڑھی سے آزادی مل جائیگی۔ سیدھا بٹن دبے گا اور جو کچھ ہملوگوں نے کھویا ہے سب واپس کردیگی یہ سیڑھی۔ پر کہاں ہوا ایسا؟ آپ سب ہی جانتے ہیں دیدی کے بعد سیڑھی اسے تاک رہی ہے۔ اور ایک دن وہ سیڑھی اسے بھی وہیں

چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں وہ مجھے ملی ہے۔ ہاں وہی جسکی کہانی اب میں آپکو سناؤ نگا —— تو پچھلی باتیں ڈراپ ایک تازہ منظر سے کہانی کا آغاز ——

کھٹ کھٹ،

کھٹ کھٹ کھٹ —— حسب معمول میں نے کنڈی کھٹکھٹائی۔

جی آپ —— ! دروازہ کھول کر کسی نہ کہا ——

ہاں میں —— !

''مگر آپ تو اوپر والے فلیٹ میں رہتے ہیں۔''

''او، ہاں، ہاں میں تو اوپر کے فلیٹ میں رہتا ہوں سوری''، پھر سیڑھیاں طے کرتا ہوا اپنے فلیٹ کے دروازے تک آیا —— گھنٹی بجائی —— پھر گھنٹی بجائی —— تیسری بار گھنٹی بجائی۔ اب سلگنا ہی چاہتا تھا کہ —— ''ارے تم۔ تم تو کبھی گھنٹی نہیں بجاتے ہمیشہ کنڈی ہی کھٹکھٹاتے ہو۔ میں سمجھی کہ۔''

''چائے بناؤ۔''

''کیسی چائے۔''

''تمہاری حرکتیں بے معنی لگ رہی ہیں —— زندگی کی طرح بے معنی ——''

''جب زندگی بے معنی ہو تو حرکتیں کیا ولیعہدوں جیسی ہونگی —— چائے بناؤ۔''

''دفتر سے تو نہیں آرہے ہو، رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں —— اگر کھانا وانا کھا لیا ہو تو پھر چائے بنادوں۔''

''سمجھو کھا لیا ہے۔ تمہاری شرطوں پر جینے کا عادی جو ہو گیا ہوں۔''

''ہاں شرطیں تمہارے پاس ہوتی ہیں —— لگاتی میں ہوں۔''

''ذرا جلدی کرو۔'' بھوک تو سخت لگی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں بھول گیا اور چائے کی فرمائش کردی۔ شاید عادتاً۔ نہیں عادتاً نہیں —— بھوک کوئی یوں ہی نہیں بھول جاتا —— ایک عجب واقعے نے چند منٹوں کے لئے ایک دم Blank کردیا تھا۔ ایک Vaccum میں داخل ہو گیا تھا میں جیسے چاروں طرف طوفان ہو اور بیچ میں سب کچھ لا پتہ —— کہیں کچھ بھی نہیں —— چند مہینوں کی بات ہے —— پاروانی نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو دروازہ کھلتے ہی بالکل

نیا چہرہ سامنے آ گیا۔

''بی بی جی گھر پر نہیں ہیں۔''

''کہاں گئی ہیں —''

''بتا کر نہیں گئی ہیں۔'' نئی ملازمہ تھی پہلے جو تھی شاید وہ اپنے پہلے والی کی طرح سبکدوش ہو گئی ہو گی — ملازم چہرے بدلتے ہی رہتے ہیں — کبھی کبھی بدلی بھی دے جاتے ہیں۔ نئی ملازمہ کے جوابات ایسے تھے کہ پاروانی اور مسز پاروانی سے تمام تر بے تکلفی کے باوجود فلیٹ میں داخل ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ ورنہ کوئی نہ بھی ہو تب بھی فراق کا ہندی ایڈیشن — ظ-انصاری کا مطالعۂ غالب یا کوئی ہندی، اردو رسالہ لے کر ورق گردانی کرنے لگتا۔ مسز پاروانی اردو اور فارسی بھی پڑھ لیتی تھیں کبھی Cassette چلا کر غلام علی اور مہدی حسن سے لطف اندوز ہوتا تو کبھی دوردرشن کے کسی Channel پر الٹی سیدھی حرکتیں اور غیر ضروری تصوریں دیکھتا، مگر اب تو — اس وقت اتفاق سے انکی Baby بھی موجود نہ تھی۔ جسے میں چڑھانے کے لئے Boby کہا کرتا تھا — اور Boby کا مطلب سمجھے بغیر آپے سے باہر ہو جاتی۔ پھر کوئی کھیل لیکر بیٹھ جاتی — کبھی تاش — کبھی شطرنج — کبھی لوڈو — کبھی Chinese cheker — مطلب یہ کہ اس کے ساتھ کھیلنا میری سزا ہوتی — کبھی کبھی تو گھر کو بیڈمنٹن کورٹ بنا لیتی — وہ کسی قاعدے قانون کی پروا نہ کرتی۔ بس وہ اپنی جیت کا اعلان سننا پسند کرتی۔ اور میں ہمیشہ ہی اسے بے ایمان کا خطاب دیکر خاموش کرنے کی کوشش کرتا۔ نئی ملازمہ کے احتیاطی لہجے نے مجھے اپنے گھر واپس بھیجدیا جب دوسروں کا گھر اچھا لگے تو پھر اپنے گھر کا تصور کتنا مسخ اور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو — وہاں لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ ٹھیک موت کی طرح — چاہے وہ کتنی بھیانک کیوں نہ ہو — آتی ہے اور ہم اسے قبول کرتے ہیں — گھر واپس آیا۔ کل ہی کی طرح قمیض اتاری — پینٹ بدل کر لنگی پہن لی — ہاتھ منہ پر پانی کے چھینٹے۔ کچھ منٹوں کے لئے بستر پر — Relaxing attitude کے سہارے لوٹ پوٹ — پھر پسند ناپسند سے پرے جو کچھ سامنے آ جائے کھانا — کچھ نیند، کچھ خراٹے — صبح دفتر اور شام کو دوسرا گھر —

''کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔''

''تو انتظار کیا ہوتا ہملوگ ذرا ریہرسل میں گئے ہوئے تھے۔'' پاروانی نے بتایا۔

''ہاں مگر'' —— اتنے میں نئی ملازمہ سامنے آگئی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھنے کی کوشش کی عمر کوئی ۱۶-۱۷ سال ہوگی۔ Baby سے کچھ بڑی۔

''یہ آج ہی آئی ہے چھندا —— نور جہاں کئی روز سے ناغا کر رہی ہے۔''

''اچھا نئی Maid Servant! دیکھو پہچان لو۔ میرے لئے یہاں کوئی روک ٹوک نہیں۔ میں کب کس وقت ٹپک پڑوں تمہارے صاحب اور بی جی بھی نہیں جانتے۔'' وہ مسکرائی اور رسوئی گھر کی طرف چلی گئی۔

اب اس نے پہچان لیا تھا۔ دوسری بار جب آیا گھر پر کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ مسکرائی ''آیئے بیٹھئے'' میں بیٹھ گیا۔ اور وہ رسوئی گھر میں چلی گئی۔ اور میں حسب معمول کوئی رسالہ لیکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں Baby آ گئی۔ ''انکل آج شطرنج کھیلو گے۔ اب ممی کی طرح کھیلتی ہوں۔ پاپا نے سکھایا ہے'' —— میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''سچ کہہ رہی ہوں اور اب میں شطرنج کھیل سکتی ہوں۔'' لیکن میں شطرنج کھیلنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوا۔ وہ خفا ہوگئی —— اس نے چھندا کو بلایا۔ وہ سہمی سہمی میرے سامنے آئی۔ Baby نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''چلو شطرنج کھیلو۔'' Baby دیدی میں یہ کھیل نہیں جانتی۔ ''ٹھیک ہے تم میرے سامنے بیٹھو میں تمہاری چال بھی چل دونگی۔'' پھر Baby نے دونوں چالیں چلیں۔ اور شکست بیچاری چھندا کے نام لکھ دی گئی۔ چھندا سہمی سہمی پھر Kitchen میں چلی گئی۔ Baby اپنی جیت پر خوش تھی۔ ''میں آپکو بھی ہرا سکتی ہوں۔''

''اچھا Baby پانی پلاؤ۔'' اس نے چھندا کو آواز لگائی۔ اس نے فریج کھولا۔ بوتل سے گلاس میں پانی بھر کر طشت کے ساتھ لے آئی۔ جب تک میں پانی پیتا رہا، وہ سہمی کھڑی رہی۔ جب گلاس خالی ہوگیا تو اس نے پوچھا۔ ''انکل'' اور؟ —— ''نہیں بس۔'' اس طرح ہمارے Dialogue کی شروعات ہوئی۔ مگر اس کے اور میرے ڈائلاگ کبھی دو چار شبدوں سے آگے نہیں بڑھے۔ مگر اس نے گھر کا ہی نہیں اپنے صاحب کے دوستوں کی پسند اور ناپسند، ضرورت اور موڈ سب کچھ اپنے ذہن میں جیسے Place کرلیا تھا۔ کون بیوپاری، کون گردھاری اور گھر کی طرح آتا ہے۔ اس نے سب کو ٹھوک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ صاحب اور میم

صاحب کی غیر موجودگی میں اس کا اپنا کیا ہوا فیصلہ ہی فائنل ہوتا — گھر کی طرح آنیوالوں میں شاید میں ہی سرفہرست تھا — لہٰذا وہ بلا جھجک مالکوں کی غیر موجودگی میں دروازہ کھول دیتی۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا۔ پاروانی اور مسز پاروانی اور Baby سب کے سب تھیٹر گئے ہوئے تھے میں پہنچا۔ صوفے پر جب بیٹھا تو وہ ایک پرزہ لیکر آئی۔ اور مجھے دینے سے پہلے خوب ہنسی۔ بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ میں نے وجہ پوچھی۔ پھر پرزہ دیکر بولی — ''میرے صاحب نے آپکے لئے یہ پرزا دیا تھا۔ مگر تین دن پہلے۔'' ''پھر؟'' ''پھر یہ کہ میں آپ کو دینا بھول گئی تھی؟ اور اب تو وہ کام بھی ہوگیا ہوگا۔ جس کے لئے پرزہ تھا۔'' ''تو پھر اسکے دینے کی ضرورت کیا تھی؟'' ''آج یاد آگیا اسی لئے دے رہی ہوں۔'' اسکی معصومیت پر میں بھی تبسم ریز ہوگیا —

اب وہ قدرے مانوس ہوگئی تھی۔ اس سے اتنا ہوا کہ میں بھی اسے اس کے صاحب یا میم صاحب کی طرح کچھ نہ کچھ بیگار کے لئے کہدیتا — کبھی یہ لے آؤ — کبھی وہ لے آؤ — ذرا پانی کا ایک گلاس لانا۔ پنکھے کا بٹن دبادو وغیرہ وغیرہ — اور مجھے ایسا لگتا کہ اب وہ میرا کام حکم سمجھ کر نہیں کرتی۔ دھیرے دھیرے اس نے مجھے بھی اپنے صاحب اور میم صاحب کے حساب میں جوڑ لیا۔ اس لئے اب میرے وقت بے وقت آنے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ پوری نشست میں کم از کم ایک بار پانی پلانا تو اس کا معمول بن گیا —

اکثر صاحب اور میم صاحب کے دوستوں کی محفلیں ہوتیں — اسے اکثر دیکھا کہ ایک کھائی کے باوجود ذہنی طور پر ان محفلوں میں Involved ہوتی بہت ہی خوش اسلوبی عزت واحترام کے ساتھ لوگوں سے پیش آتی۔ اسکے چہرے سے لگتا وہ سب کچھ اپنے من کے اندر سے کر رہی ہے — ایسے جیسے یگیہ کر رہی ہو۔ رات کے کئی پہر بیت جانے پر بھی اس کی آنکھیں پلکوں کی چادر نہیں تانتیں — غرض وہ اس گھر کی تنہائی — ہر شور کا حصہ بن چکی تھی جیسے وہ خود ہی گھر بن گئی ہو —

ایک دن وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ میں کہیں سے بہت تھکا تھکا آیا تھا۔ ماتھے پر کچھ بوندیں ابھر آئی تھیں۔ بیٹھتے ہی اس نے پانی کا گلاس پیش کیا۔ میں نے اسے خاموش

دیکھ کر کہا—— ''بہت تکلیف دیتا ہوں تم کو۔''

''اب کیا ۱۷-۱۸ دن اور'' اس نے جواباً کہا—— ''مطلب۔'' میں نے قدرے چونک کر کہا—''مطلب دیدی میری شادی کر رہی ہے۔ ۱۸ تاریخ کو—— ۱۸ کو میں چلی جاؤنگی۔''

''اچھا۔''

آج اٹھارواں دن تھا—— اور آج کے واقعہ نے کتنا Blank کر دیا تھا۔ اس کی دیدی اسکو لینے آ گئی تھی۔ بس اسے یہاں سے جانا تھا۔ کل ہی اسکی شادی تھی—— گھر نہ گا جانہ باجا—— نہ مانجھا نہ چوکی—— معلوم نہیں کیسی شادی تھی—— پر تھی اسکی شادی—— اسکی بہن کھڑی تھی اور وہ جانے کے لئے اپنے کپڑے چن چن کر گٹھری میں ڈال رہی تھی—— دو پوٹری —— ایک اس نے ایک اس کی دیدی نے اٹھائی—— صاحب اس دن ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ میم صاحب اور Baby گھر پر تھیں۔ صاحب کے ایک دوست بھی بیٹھے تھے۔ رات کے نو بج رہے ہونگے۔ رنگین ٹیلی ویژن پر جنگلی جانوروں کی حفاظت پر بھاری لاگت والی ایک فلم چل رہی تھی۔ موضوع تھا مگر مچھ۔ مگر مچھ کی حفاظت اور نسلی افزائش پر بڑی دلچسپ فلم تھی۔ مگر مچھ کے جوڑے اسکرین پر بے حد Intimate لگ رہے تھے۔ ادھر چھندا جا رہی تھی، ہاتھ میں اتارن کی پوٹلی۔ اور آنکھوں میں بچی کھچی اداسی۔ وہ میم صاحب کے پاس آئی——

''جاتی ہوں میم صاحب——''

''جا رہی ہو—— اچھا پھر آنا۔ جب موقع لگے۔'' وہ بے جواب آگے بڑھی۔ صاحب کے آئے دوست کے پاؤں چھوئے۔ پھر میم صاحب کے۔ اور پھر میرے پاس آ کر بولی Uncle جاتے ہیں۔ میرے پاؤں چھوئے۔ پر میں مگر مچھ کی حفاظت پر بنی فلم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے اچھا کہا اور فلم میں گم ہو گیا۔ وہ متزلزل سی، قدم دھیرے دھیرے آگے بڑھاتی رہی۔ اس کی بہن ذرا اور آگے پہنچ چکی تھی۔ کیسا منظر تھا۔ جیسے وہ شادی کے لئے نہیں بلی کے لئے جا رہی ہو—— بھلا اب لڑکی دو پوٹلیوں کے عوض دولہے کا خواب دیکھ سکتی ہے۔ رخصت ہوتی ہوئی چھندا کے من میں چاہے کیسے ہی بھیانک خدشات رہے ہوں۔ مگر میں مگر مچھوں کو باہمی اختلاط میں مصروف دیکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ نظروں سے اوجھل

ہوگئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ادھر پردے پر مگر مچھ کے پھوں پھوں کی آواز ابھری۔ پھر یکا یک محسوس ہوا جیسے ٹی وی اسکرین اور میرے درمیان کوئی دیو پیکر چیز آگئی ہو——

نظر اٹھائی دیکھا چھندا کھڑی تھی۔

ارے کیا ہوا؟

"کچھ نہیں۔ تو پھر ——Uncle——"

"ہاں"

"جاتے ہیں Uncle" پھر وہ پوٹلی سمیت بڑی تیزی سے دروازے کی طرف لوٹ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک آیا۔ سیڑھیوں سے اترتے اترتے اس نے بی بی جی کو پھر مجھے تاکا—— اور دور ہی سے بولی——

"بی بی جی، uncle جاتی ہوں۔" اور وہ نیچے اترتی ہوئی سیڑھیوں میں آنسوؤں سمیت ڈوب گئی۔ میری آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو ڈبڈبا آئے۔ مگر مالک کے گھر سے جانے والی ملازمہ کے لئے آنسو۔ میں نے ان آنسوؤں کو پی لیا۔ اگر یہ ٹپک پڑتے تو مگر مچھ کے ہی آنسو کہلاتے——

ٹی وی کے رنگین پردے پر مگر مچھ نر مادے محفوظ مستقبل کا حسین خواب دیکھ رہے تھے۔ اور وہ الٹے بٹن والی الٹی سیڑھی مگر مچھوں کی خوراک حاصل کرنے کے لئے پھر وہیں جا پہنچی جہاں سے اسکی کہانی کی نائکہ چھندا اس پر سوار ہوئی تھی۔

اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا چھندا کی یہ کہانی میں بار بار لکھتا رہونگا؟؟

ہاں لکھتا رہونگا۔ اس وقت تک جب تک آپ سب سیدھا بٹن دبانا نہ سیکھ جائیں۔!!!

☆☆☆

پانچ مردے

شہر کا یہ مشہور 5-Point Crossing بے حد مشغول سڑکوں کا ایک سنگم تھا۔ پانچواں حادثہ اسی کراسنگ پر ہوا کرتا تھا۔ ٹرافک کے بے شمار ضابطے طے کئے گئے۔ سڑک پر چلنے پھرنے والوں کو اس مخصوص نکڑ پر چلنے کی خصوصی ہدایت دی گئی —— ہر ممکن حفاظتی اقدام کئے گئے۔ مگر شہر کا پانچواں حادثہ اسی سڑک پر ہوتا۔ آہستہ آہستہ یہ بات ٹرافک پولس کے جوانوں کے ذہنوں میں گھر کر گئی کہ اس نکڑ پر محکمے کا قانون نہیں چلتا ہے۔ کیوں کہ جس دن حادثہ ہونا ہوتا ہے اس دن سپاہی ڈیوٹی میں ڈرائیوروں کو اپنا داہنا ہاتھ دکھاتے ہیں تو ڈرائیور اسے دایاں کی جگہ بایاں ہاتھ سمجھ کر ٹال دیتے ہیں اور گاڑیوں کی رفتار اور بھی تیز کر دیتے ہیں

—— پھر حادثہ، وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نکڑ پر ملنے والی سڑکیں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں اس بارے میں بھی لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سڑکیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ اور کسی کی رائے میں یہ یہیں پہ ختم ہوتی ہیں۔

شہر کے انتظامیہ کے لئے یہ نکڑ ایک تشویشناک صورتحال اختیار کر چکا ہے۔ پانچواں حادثہ اور پانچویں موت پر اس نکڑ کا اختیار نہ صرف اخبارات کی سرخی بنتا بلکہ سائنسی ذہنوں کے لئے ایک چیلنج بھی۔

حادثے کی روک تھام کے لئے انتظامیہ کو طرح طرح کے مشورے بھی موصول ہوتے، تجویزیں رکھی جاتیں —— کچھ لوگوں نے یہ بجھاؤ دیا کہ اس کراسنگ کو ختم ہی کر دیا جائے —— دیواریں ایسی کھینچوادی جائیں کہ پانچوں سڑکیں یہیں ختم ہو جائیں —— ایک تجویز یہ بھی تھی کہ پیدل چلنے والوں کے لئے چوطرفہ پل بنایا جائے لیکن مقامی شہری اس بات پر رضامند نہ ہوئے۔ مقامی شہری اس پرانی یادگار کو کسی طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ نکڑ انہیں وراثت میں ملی تھی۔ نہ جانے انکی کتنی پشتیں سڑکوں سے گزر گئیں —— غرض کہ اس نکڑ کی ترمیم و تنسیخ کی ہر اسکیم مقامی باشندوں کی مزاحمت کا شکار ہوئی۔

ایک دن اچانک ایک تجویز نے عملی شکل اختیار کرنے کی کوشش کی —— تجویز یہ تھی کہ اس نکڑ کو ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا جائے۔ Administration نے اس سلسلے میں اپنے اختیارات خصوصی کا استعمال کرتے ہوئے ضمنی احکامات جاری کئے۔ اور جب تک یہ نکڑ پارک میں تبدیل نہ ہو جائے اس وقت تک تیز رفتار گاڑیوں کے لئے No Entry کی تختیاں لٹکا دی جائیں۔ سب کچھ بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ آثار یہ تھے کہ صدیوں پرانی یہ سڑکیں لمحوں اور پلکوں میں اپنا وجود کھو بیٹھیں گی اور اس کے عوض وہاں کے بسنے والے لوگوں کو ایک خوبصورت ماڈرن پارک، بابائے قوم کی ایک کالی سی کانسے کی مورتی، بچوں کے لئے جھولے، بھول بھلیاں اور اٹھارہویں صدی کا سن ڈائل، پنجڑے میں بند قومی پرندہ، خوش رنگ پھولوں کی کیاریاں، مفت ہاتھ آجائیں گی اور ساتھ ساتھ تمام بدحواسیوں سے چھٹکارا اور ایک زبردست face-Lift —— اچانک یہ سب کچھ ہونے کی ایک وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ

ایک دن Administrator کی اکلوتی اولاد لاپتہ ہوگئی تھی۔ قیاس یہی ہے کہ وہ بھی پانچویں حادثہ کا شکار ہوگئی۔ حسن کاری کی کوشش جاری رہی مگر پھر بھی کچھ نہ ہوسکا۔

مقامی باشندوں کی مزاحمت رنگ دکھاہی گئی۔ حکم بجالانے والے حادثے کی زد میں آنے لگے۔ بم اندازی کے واقعات رونما ہوئے۔ پوری فضا دفعتاً سوگوار ہوگئی —— ٹی وی، ریڈیو، اخبارات نے پوری قوم پر یہ حادثات مسلط کردیئے۔ ہر فرد کے سر پر ایک بم رکھ دیا گیا ہو جیسے۔ سب کے سب Explosion کے خطرات سے دوچار تھے۔ Administrator کا گھبرا جانا قدرتی بات تھی۔ اس نے ایک مجلس مشاورت بنائی جس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اس کے لئے ناپسندیدہ تھے۔ اس نے یہ بھی کیا کہ شامل لوگوں سے ایسے بیانات دلوائے کہ جس سے شہر میں امن واماں کی فضا قائم ہو۔ مگر لاحاصل۔ Administrator نے احکامات واپس لئے اور وہ نکڑ اپنی جگہ پر قائم رہا۔

آج تک حادثے کی زد میں اجنبی آتے تھے اس نکڑ کے بارے متحیر کرنے والی اور بھی باتیں سننے کو ملتی ہیں، مثلاً یہ کہ یہ سڑکیں بہت دور سے گزر کر شہر میں آتی ہیں۔ ریاستی قصبے سے۔ سنا گیا ہے کہ جب یہ سڑکیں کھدائی کے مرحلے میں تھیں تو مزدوروں کو سانپوں نے ڈس لیا تھا۔ مزدور کی موت سڑکوں کو ایک نئے موڑ پر لے آئی۔ یعنی انہوں نے کام بند کردیا۔ سڑک کوئی اور نیا موڑ لینے سے پہلے ہی بیٹھ گئی۔ اور جب یہ ہنگامہ شہر تک پہنچا تو محل داروں میں بے چینی پھیل گئی۔ طے پایا کہ کسی طرح مزدوروں کو سانپ کے کاٹے سے بچایا جائے۔ ایک پہنچے ہوئے سادھو نے یہ بتایا کہ سڑک بلی چاہتی ہے۔ کنواری چھوریوں کا بھوگ کر کے انکی بلی کرائی جائے تو سراپ بہت جلد سماپت ہو جائیگا —— محل داروں نے راتوں رات کنواریوں کا انتظام کیا۔ بھوگ کے بعد انکی بلی چڑھائی گئی مگر سانپ کے ڈسنے کے واقعات بدستور قائم رہے۔ لوگوں نے اس سادھوں کی تلاش کی مگر بے سود —— پھر اچانک وہ سادھو ایک دن آپ ہی پرکٹ ہوا۔ راج جوتشی نے اسے سوانگی، مکار اور ڈھونگی بتایا —— سادھو نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا ——

"مورکھ جن چھوریوں کی بلی چڑھائی گئی تھی ان میں سے کوئی بھی کنواری نہیں تھی۔"

سادھو کی بات سنکر شور مچانے والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ تب سادھو نے اپنی تل

ہتھی پر ہنسوے کی نوک سے پانچ لکیریں کھینچی —— پھر کیا تھا، وہ سڑکیں خود بخود بنکر تیار ہوگئیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سڑکوں کے سنگم پر ایک ٹاور تھا اور اس پر ایک دوربین نصب تھی۔ دراصل یہ دفاعی انتظام تھا۔ پانچ سڑکیں اس لئے بنائی گئی تھیں کہ فوجوں کی پیش قدمی یا پس قدمی میں دقت نہ پیش آئے۔ غرض کہ سڑکیں، جنگی معرکوں کے پیش نظر بنائی گئی تھیں۔ بڑے بوڑھے یہ کہتے سنے گئے کہ دشمنوں کی کئی فوجی ٹکڑیاں اس ٹاور کے نیچے پسپا کردی گئی تھیں۔ مگر اب اس ٹاور کا کہیں بھی نام ونشان نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ وہ ٹاور کسی زلزلے میں ٹوٹ کر ناپید ہوگیا۔ اور دوربین کوئی قزاق اٹھا کرلے گیا۔

شہر کے باسیوں نے ایک صبح اخباروں میں اس نکڑ پر ہونے والے ایک واقعہ کی تصویر دیکھی۔ نکڑ کے بیچ و بیچ ایک انسانی پتلا سر کے بل کھڑا ہے —— بائیں طرف کی انگلیاں زمین کی طرف اشارہ کررہی ہیں مگر زمین سے لگی ہوئی نہیں۔ سر بھی اوپر ہی معلق ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان سر کے بل جھولتا ہوا پتلا جس کے پانچ ہاتھ پانچ پاؤں، پانچ آنکھیں، پانچ ناک اور پانچ پیشانیاں تھیں نہ جانے کہاں سے آکر اپنے آپ اس نکڑ پر جھولنے لگی تھیں۔ ماہرین علم کیمیا اس بات پر مختلف الرائے تھے کہ یہ پتلا کس دھات کا بنا ہوا تھا۔ اس کا Chemical combination کیا ہے۔ یہ نہ کانسے کا، نہ تانبے کا، نہ لوہے کا —— جن لوگوں نے اسے چھوا ہے ان کا کہنا ہے کہ کسی لاش کی ممی کو کوئی یہاں لٹکا گیا ہے۔ مگر یہاں کی ماٹی اسے قبول نہیں کررہی ہے۔ یہ ایک بے زمین لاش تھی جو یہاں کی تپتی ماٹی پر سر کے بل اترنا چاہتی تھی۔ مگر یہ پانچ پانچ ہاتھ پاؤں، پانچ پانچ آنکھیں یہ سب کیا ہیں۔ کیا بھید ہے۔

شہر کے کچھ ذی شعور فنکاروں نے ایک تجزیاتی گروپ قائم کیا۔ ان میں کچھ مصور، کچھ بت تراش، کوئی شاعر، کوئی فوٹو گرافر، کوئی کہانی کار تھا۔ یہ سب اپنے اپنے میدان میں مشہور و معروف تھے۔ اماوس کی رات تھی۔ یہ گروپ 5-Point Crossing کی جانب اس طرح روانہ ہوئے جیسے ٹرکنگ کے لئے لوگ پہاڑوں میں جاتے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ پانچوں فنکار اس نکڑ پر کب پہنچے، وہاں کتنی دیر رہے، اور کیا کیا؟

جب اماوس کی رات ڈھل گئی تو سورج اس خبر کے ساتھ طلوع ہوا —— ''پانچ

مشہور فنکاروں کی ایک ساتھ موت — اس پر اسرار موت کے لئے 5-Point Crossing پر تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کی مانگ۔ اس نکڑ پر وہ پتلا جوں کا توں کھڑا تھا۔ شہر میں اس پتلے کی وحشت نا کی اور فنکاروں کی موت نے زبردست سنسنی پیدا کر رکھی تھی۔ پہلے شہر کا پانچواں حادثہ یہاں ہوا کرتا تھا۔ مگر ایک ساتھ پانچ کی موت۔ اس لاش نے آ کر اس نکڑ کی روایت ہی بدل دی۔ شہر کا Administrator اپنی تمام کاروائیاں کر کے شکست تسلیم کر چکا تھا۔ لوگوں نے اس کے تبادلے کی اپیل کی۔ اور وہ بدل گیا۔ اور چھوڑ گیا سب کچھ جیسے کا تیسا — یعنی وہ سر کے بل کھڑی ہوئی عجیب و غریب لاش، اس سے جڑی ہوئی پانچ سڑکیں اور حادثات سب اسی طرح موجود تھے۔

نئے Administrator نے چارج سنبھالتے ہی اس سر کے بل کھڑی لاش اور نکڑ پر ہونے والے واقعات کی تحقیق کے لئے فوراً ایک High Power کمیٹی بنائی — اس کمیٹی نے کئی سال بعد ایک سنسنی خیز رپورٹ پیش کی۔ جو کچھ یوں ہے ——

"کمیٹی کے پانچوں ممبران کو اس امر سے اتفاق ہے کہ اس نکڑ پر پانچ سڑکیں ہی ہیں۔ پانچواں حادثہ بھی یہیں ہوتا ہے۔ ٹرافک پولس بھی تعینات ہے۔ سر کے بل جھولتی ہوئی پانچ پانچ ہاتھ پاؤں والی لاش بھی وہاں موجود ہے۔ مگر یہ سب فرض کی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ یہ فرضی یا تصوراتی نکڑ، سڑکیں اور پانچ ہاتھ پاؤں والی لاش لوگوں کے ذہنوں کا فتور ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں۔ لوگوں کے ذہنوں سے ان خیالی سڑکوں کو اگر کاٹ کاٹ کر نہ نکالا گیا تو —"

اخباروں کی یہ رپورٹ ہے کہ اب کمیٹی کے ممبران دنیا کی ہر پانچویں شئے سے بے حد خوف کھاتے ہیں۔

☆☆☆

پانی پانی شرم

لاشہ بر لاشہ
خون بہ خون
سیاہ بر سفید
تمثیلی مرقع
فوٹو آف سیٹی ریوڑیاں
آؤ ایک منظر طے کریں
گوشت کی جلی کٹی بوٹیوں سے ایزل پر ایک شہکار وجود میں لائیں۔ پھول کی تلوار

چپکا دیں ایک طرف۔ نیزے، کلہاڑے، برچھیاں، بم، بولٹ، دہکتی سرخیاں...... ایک چوڑی اور دہکتی کوکھ میں بھر دیں۔ بارود کو آگ میں تبدیل کر دینے والے فلیتوں کے نیچے ڈالدیں ٹھنڈی اور خاموش تیلیاں، خطاوار انگلیاں، بے ریا، معصوم گرم بوندیں۔

اور ایزل پر چپکائی ہوئی ان بے ضابطگیوں کا نام رکھدیں...... کولاژ...... کولاژ۔ جس میں سب کچھ اور کچھ بھی نہیں دونوں برابر۔

مگر......

ان طے شدہ منظروں میں، وہ، کہاں ہے جسکے لئے سارے مناظر ایزل پر چڑھائے گئے۔ اگر اس ایزل پر وہ نہیں ہے تو کمرے سے ایک تصویر نکال کر Enlarage کی جائے۔ مگر اس سے پہلے Negative کو روشنی کی مدد سے کریدا جائے...... اس مرحلے کے درمیان...... کیمرے سے اندر کا باہری جھانکتا ہے اور بڑی سبک روی سے Transparancy میں اترتا ہے۔ نظر آتا ہے کچھ دھندلا دھندلا۔ آنکھوں پر Power رکھتے ہی سب کچھ صاف ہو جاتا ہے...... اندر کا باہری۔ کچھ برہنہ، کچھ ڈھکا ہوا۔ فٹ پاتھ پر Oblique کے دائیں جانب ٹخنوں پر سر اور کہنی ڈالے بیٹھا ہے رُبیٹھی ہے۔ Oblique کھڑا نہ پڑا۔ semi-nude ادھ ننگا۔ پورا ننگا نہیں ہوا جاتا۔ اسکے ادھورے احساس کی یہ نصف سچائی شاید اب بھی بچی ہے۔ یہ اس تنگ چادر کے طفیل جس سے اس نے چھپانے والی چیزیں چھپا رکھی ہیں۔ جیسے سامنے سے عضو افزائش، بدبودار جھاگوں کے سوکھے چپڑے، اینٹھے سخت سیاہ ریشوں سے الجھے۔ اور اغل بغل۔

(focus) فوکس سے غائب ہوتی ہوئی ایک بڑھیا، سائیکل سوار اور ہرے ہرے درخت، فٹ پاتھ سے لگی دور جاتی ہوی سڑک اس فوکس کے اندر۔ مگر میل کا کوئی پتھر؟ شاید عکس رینج سے باہر۔

Close-Up! پیٹھ، کمر، کولہے...... سب ہی ننگے۔ کیمرے کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتا وہ۔

قومی میگیزین کے فریم سے نکل کر یہ تصویر ایک Click کے ساتھ اصل میں تبدیل۔ ایک جھٹکے کا احساس۔

اندر کے باہری کی آنکھیں کسی اور شے کے پیش نظر چڑھی ہوئیں۔ جبکہ Transparancy واضح تھا۔ تنگ چادر سے سامنے کا ستر چھپا ہوا۔ پشت کا سارا حصہ بالکل ننگا۔ بیٹھا

اس طرح جیسے کبھی نہ اٹھے گا۔ ۳۰۔ ۳۵ برس کا ہاڑ پٹھار پٹھی بدن۔ سامنے وار نڈے سے ایکسرے کرتی نگاہیں۔ چادر کافی دبیز۔ ایکسرے کی ناکامی۔ بال آج یا ابھی کی اسٹائل میں بنے ہوئے۔ مونچھیں ر پلکیں مردانگی ملکوتی سطح تک جھکی ہوئیں۔ معلوم نہیں کب سے اسی حال میں بیٹھا ر بیٹھی ہے۔ شاید کچھ دیر پہلے سے یا پچھلے پہر سے۔ ممکن ہے کل رات سے ہی۔ نام بھی نہیں پوچھا کسی نے شاید۔ چونکہ اسکی پشت ننگی ہے اس لئے ہر شخص کی پشت اسکی طرف ہے۔ (ویسے ایسا ہی ہے اس پر اصرار نہیں کیا جا سکتا) جب بھی اسکی طرف سے پشت پھیر کر نکل رہے ہوں تو نام، ٹھکانہ، نسبت، کون پوچھے۔ وہ زندہ مگر بے حرکت...... چہرے پر کیفیتوں کا سمندر آنکھوں میں کہانیوں کی جھیل۔ اب اس سے خطاب۔

کیوں سنگی؟ کس نے کہا تھا میگزین کے سنہرے فریم سے نکل کر CMDA کی اس کالی سڑک اور مصنوعی چھانوں پر بیٹھنے کے لئے۔ کوئی جواب نہیں تمہارے پاس۔ اچھی بھلی تھی تمہاری موجودگی۔ Elitist ڈرائنگ روموں میں۔ ممکن ہے تمہارے نیم برہنہ جسم پر بوسے بھی ثبت ہوئے ہوں۔ کون جانے کتنا مزہ آیا ہوگا۔ صوفے پر چت پڑا ر پڑی وہ۔ اور تمہارا بدن۔ مگر تم۔ تمہارا بدن محض تصویر۔ اور وہ بھی سامنے کا حصہ چادر سے ڈھکا ہوا۔ تمہاری طرف سے ہو ہی کیا سکتا تھا۔ سب کچھ تو یکطرفہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ ہو ہی رہا ہے یکطرفہ۔

دیکھو خبطی...... اپنی گردن اس طرف موڑو۔ مگر تمہارے لئے یہ ممکن نہیں۔ کیمرے نے تمہیں جس طرح سے کھینچا ہے ویسے ہی رہنا ہے نہ تمہیں۔ اگر تمہاری گردن اس طرح مڑ سکتی تو تمہیں پتہ چلتا کہ کئی آنکھیں چمنبک کی طرح تمہارے بدن پر چل رہی ہیں۔ غضب ہے تمہارا ایک ہی انداز میں ساکت ہو جانا۔ کاش کہ تمہیں دِکھتا کہ تمہاری پشت پر سارے منظر الٹ پلٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہیں ایسا نہیں لگ رہا ہے کہ تمہاری ننگی پیٹھ کی جانب چھاونیاں اپنا رخ کرنا چاہتی ہیں۔ اپنی پشت نہیں بچاؤ گے ر گی۔ یا صرف سامنے کے عضو مخصوص کی حفاظت کرتے کئی یگ نکل جائیں گے۔ بھاگتے ر بھاگتی کیوں نہیں۔ اٹھ کر۔ چادر چھوٹی ہے۔ کھڑے ہوتے ہی سراپا ننگا۔ شرم آتی ہے۔ مگر کب تک یونہی...... تمہیں معلوم ہے یہاں کی سڑکیں چوتی ہیں۔ تم جہاں بیٹھے ر بیٹھی ہو وہاں بھی سڑک چوتی ہے۔ ہر سڑک کے نیچے سراخ جو سرنگوں میں تبدیل ہو چلے ہیں۔ روز ۸۰ لاکھ چوہے ان سڑکوں کو چالتے ہیں تم نے غور کیا، تمہاری پشت پر سے کتنے چوہے گذر گئے۔ چوہے کے لشکروں نے معائنہ کیا تھا

تمہاری پشت کا۔ کتنی چوڑی اور مضبوط ہے تمہاری یہ پیٹھ۔ تمہیں خبر ہے جو کچھ تم نے چادر سے ڈھک کر بچا رکھا ہے چوہے اندر گھس کر انہیں بھی کتر دیں گے۔ پھر کیا رہ جائے گا تمہارے پاس سربلندی کے لئے۔ صرف ننگی سپاٹ پیٹھ اور کمر ......چھی

اٹھکر بھاگنے میں کیا قباحت ہے؟۔ خیر خبردار کردوں تمہیں کہ آسمان طوفان کے نرغے میں ہے۔ بادل برسنے کے بگل بجا رہے ہیں۔ سنائی پڑ رہا ہے تمہیں۔ کیا ہوگا اگر یہ بادل سڑکوں پر اتر پڑیں۔ اس چھوٹی سی چادر سے کیا کچھ بچ جائیگا۔ سڑک۔ جہاں تمہاری نشست ہے۔ وہ بھی سوراخوں سے زخمی ہے۔

دیکھو سائیکل سوار اور بڑھیا دونوں سڑک سے غائب ہو گئے۔ سڑک بھی غائب ہو جائیگی۔ بادلوں نے تم پر برسنے کا اعلان کر دیا ہے۔ کتنی جارح بوندیں ہیں۔ ہتھیا برس رہا ہو جیسے۔ دیکھو ہاتھی کے پاؤں تلے نہ آجاؤ۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ بھاگنے کی کوشش کرو۔ مگر تم ویسے ہی چادر کو دبوچے ہو۔ جبڑا سخت۔ دانت پر دانت چڑھے۔ چہرے پر کیفیتوں کا جلوس۔ آنکھیں بے تاثر۔

وہ سامنے بیٹھا ہوا کتا بھی اونچی جگہ کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سڑک پر پھولتا ہوا پانی شاید تمہیں ڈبودے۔ سامنے کی تمام کھڑکیاں، دروازے بند۔ اٹھو، جلدی کرو، دیکھو چند لمحوں میں سڑک ندی ہو جائگی۔ چادر کے سوا کچھ بھی نہیں تمہارے پاس۔ اور کشتیاں پانی کی الٹی دھار عبور نہیں کرتیں۔ نہیں آئینگی وہ تمہارے پاس۔ اٹھ جاؤ ننگی۔ بھاگ جاؤ۔ دیکھو تمہاری گردن پانی سے نپ رہی ہے۔ ڈوبنا مقدر ہو جائیگا۔ اور یہ کیا۔ تم غائب۔ کہاں ہو ننگی؟ پانی کی تہوں میں۔ سارے گراؤنڈ فلور اور سرنگیں بھر گیئں۔ سب چوہے جائے پناہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے مگر تم۔ ارے واہ ننگی تم تہوں سے اوپر۔ شاباش گردن برق رفتار پانی سے لڑتی ہوئی۔ سارا بدن پانی سے ڈھکا ہوا۔ پشت بھی ڈھکی ہوئی۔ چادر کہاں گئی۔ وہ بد بخت چادر۔ تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ آگے بڑھتے قدم۔ پر وہ چادر! وہ جارہی ہے چادر۔ شرم نہیں آتی تمہیں ننگے رنگی بے شرم۔ پانی کا لباس کب تک۔ پانی اتر گیا تو؟؟

☆☆☆

کرفیو سخت ہے

سورج کہیں لاپتہ ہو چکا تھا۔! یا کسی نے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دی تھی......
یا پھر کوئی دبیز سا کمبل اوڑھکر اوندھے لیٹ گیا تھا سورج ...... اب جبکہ سورج لاپتہ ہو چکا ہے......

سار ی باتیں زمین کے حوالے......
سارے معرکے اندھیروں سے
ان اندھیروں میں پیلیا روشنی لئے......
بیرسٹر داہر کا کمرہ!

دیواروں پر کتابوں کے لمبے لمبے شلف بھلا دی جانیوالی ساری بڑی بڑی کتابوں کا مدفن۔ کل ملا کر یہ کمرہ بوسیدگی کی طرف مائل تھا۔ دیواروں پر سفیدی برسوں سے نہیں ہوئی تھی۔ شیلف کے شیشے جا بجا ٹوٹے ہوئے تھے۔ چمگادڑوں اور کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کوئی کوئی کتاب شیلف سے باہر آتی ہوئی اٹک گئی تھی جسے مکڑیوں نے جالے بن کر انہیں نیچے گرنے سے روک دیا تھا۔ میز کرسیاں، کھڑکیوں کے پٹ، سب گرد آلود تھے۔ پرانی وضع کا ایک بجلی پنکھا اور مخدوش لیمپ شڈ چھت سے لٹک رہے تھے۔ اس میں لگا نحیف سا بلب جلنے پر بھی بجھا بجھا سا لگ رہا تھا، بجھی بجھی کیفیت میں جلتے ہوئے اس بلب کے نیچے ایک گول میز تھی جس پر تین سروں کے سائے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

داہر کے سامنے قاسم اور اس کا ایک محرر بیٹھے تھے، داہر پے در پے کئی مقدمے ہار کر اپنی وکالت کی ساکھ بگاڑ چکے تھے۔ امام فیملی کے ایڈوکیٹ قاسم نے بھی داہر کو ایک بھاری شکست دی تھی اور اس کے بعد بیرسٹر داہر اپنے موکلوں کے لئے گمنام ہوتے چلے گئے تھے۔ شکست و فتح اپنی جگہ، دونوں کے ذاتی تعلقات بہت گہرے تھے، کورٹ کے باہر دونوں ایک دوسرے کے زبردست حلیف تھے، مگر سورج کے اچانک غائب ہو جانے پر قاسم ہیبت ناک مقدمے میں پھنس گیا تھا۔ داہر، قاسم اور محرر تینوں کے چہروں پر تناؤ تھا۔

کمرے کی پھیکی روشنی بھی فی الوقت انکے لئے چمکتی سی امید تھی، کیونکہ کمرے سے باہر کی روشنی، روشنی جیسی تو تھی پر روشنی ہرگز نہ تھی۔ کمرے کی تیرہ بختی سے کہیں زیادہ بدبختیاں کمرے کے باہر کھڑی تھیں۔ خموشی، سناٹا، سکرن، سیلن، شاید یہ کمرہ اپنی خستہ حالی کے سبب بیرونی عذابوں سے بچ گیا تھا۔ ورنہ اسکے بغل والا مکان خشت خشت چھٹک کر ڈھیر ہو چکا تھا......

ملبے کے اوپر پہرہ لگا دیا گیا تھا......

''تم پتے پھینٹوں میں باہر جھانک کر آتا ہوں۔''

''کھڑکی مت کھولنا، سن سے گولی اندر آجائیگی''

''کبھی اندر جھانک کر دیکھا نہیں۔ باہر جھانکنے سے کیا فائدہ۔''

''جبکہ اب باہر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں۔''

''جب بغل والا مکان خشت خشت ڈھیر ہو رہا تھا تب کھولی تھی کھڑکی''

''تب تو آنکھیں موندلی تھیں شتر مرغ کی طرح''

''ویسے میں نے دیکھا تھا کھڑکی کھول کر۔''

''کب؟''

''جب سورج نقاب بند کیا جارہا تھا۔ اندھیارا دھیرے دھیرے زمین پر اتر رہا تھا۔''

''شاید اسی وقت جب میں تمہاری طرف آرہا تھا یہ جانے بغیر کہ باہر گولیوں کا پہرہ ہے۔ HALT! کی آواز پر نہ رکتا اور دونوں ہاتھ اوپر نہ اٹھاتا تو شاید وہیں سڑک پر ڈھیر کر دیا جاتا۔''

یک بیک بجلی چلی گئی...... میز نے سایوں کو جذب کر لیا۔ باہر کی سنگینی کمرے میں در آئی۔

''دروازہ بولٹ ہے نا۔''

''بولٹ ہے مگر۔''

''ادھر ادھر مت پھرو ایک ذراسی آواز آفت ڈھا سکتی ہے۔''

''اب تو تاش بھی نہیں کھیل سکتے۔ ڈھیر سارے وقت کا ہم کیا کریں گے؟''

''بیان جاری رکھو مگر سرگوشیوں میں۔ جب دھیرے دھیرے زمین پر اندھیرا اتر رہا تھا تو......''

''تو میرے کانوں کو محسوس ہوا دور کہیں دور ایک آواز گشت کر رہی ہے۔''

''کیسی آواز تھی''۔

''اذان تھی شاید جو میلوں میل گشت کرتی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔'' ''پھر!''

''پھر میں نے دیکھا بغل والے منہدم مکان کے ملبے سے لہولہان لوگ سر پر ٹوپیاں رکھے باہر آرہے ہیں۔''

''کیا اس مکان کے مکین ملبے میں دب کر مرے نہیں؟''

زندگی اور موت کا پتا نہیں۔ ان کے چہروں کی بے خوفی زندگی کی تھی یا موت کی میں طے نہیں کر پایا۔''

پھر کوئی شئے ادھر سے ادھر ہوئی۔ ٹھک سے کسی چیز کے گرنے کی اواز ملی۔ تینوں سہم کر چپ ہو گئے۔ شاید شلف سے باہر نکلی ہوئی کسی کتاب سے چمگاڈر ٹکرا گئی تھی۔

''کچھ نہیں، 'کتاب گری ہے اوپر سے۔ شلف کے سارے شیشے چور ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ کوئی دن یہ ساری کتابیں گر پڑینگی زمین پر، تب کیا ہوگا مسٹر داہر؟''

''وہی ہوگا جو کتابوں کے آنے سے پہلے ہوا تھا۔''

''تم کہہ رہے تھے کہ ملبے سے لوگ باہر آرہے تھے۔''

''ہاں وہ باہر آرہے تھے۔ مگر آواز کی طرف روانہ ہونے سے قبل اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیتے۔ کرفیو میں ایسا نہ کرنے سے گولی ماردی جاتی ہے۔''

داہر کی بیٹی درگا چائے کی تین پیالیاں اسی اندھیرے میں لے کر آگئی۔ شاید اسے احساس ہو چلا تھا کہ کمرے میں محبوس قاسم اور اس کا محرر اسکے بغیر بڑی بیکلی محسوس کر رہے ہونگے۔ درگا نے اندھیرے میں بیحد احتیاط کے ساتھ تینوں چائے کی پیالیاں بڑھائیں مگر چائے انہیں یاد ہی نہ تھی، بیان جاری تھا۔

''پھر میں نے بہت غور سے آواز سنی۔ اذان تھی وہ آواز۔ دونوں ہاتھ اٹھائے لوگ قطاروں میں آواز کی جانب بھاگے جارہے تھے۔''

''بڑا عجیب منظر تھا۔''

''عجیب منظر۔ مجھے نہ جانے کتنے منظر، کتنے لوگ نظر آئے سب لہولہان۔ مگر رواں۔''

''تم دیکھکر' ہم دونوں سنکر حیران ہیں۔ کیا اب بھی باہر یہی منظر ہوگا۔''

''مجھے یقین ہے کہ اب بھی باہر یہی منظر ہوگا۔ جب تک جائے نماز نہ مل جائے یہ لوگ ملبوں سے لہو میں ڈوبے نکلتے رہیں گے۔''

''مگر ہم نے کھڑکیاں بند کرلیں ہیں۔ ہم گوشۂ عافیت میں پڑے ہیں۔'' ''جاؤ ذرا کھڑکی کھولو اور سنو، کیا آواز اب بھی آرہی ہے؟''

''نہیں کھڑکی کی طرف مت جاؤ ورنہ یہ مکان بھی ملبے میں بدل جائے گا۔''

''مگر ملبے سے ہی تو زندہ لوگ برآمد ہوتے ہیں، صالحین نے جو کچھ کہا، تم نے سنا نہیں۔''

''کیوں نہ ہم بھی............''

''داہر ہم بھی اس آواز کی طرف روانہ ہونا چاہیں گے۔ شاید ہمیں بھی نماز مل جائے۔''

''مگر جانے سے پہلے ہمیں داہر کے کمرے سے چمگادڑ کو بھگا دینا ہوگا ورنہ یہ ساری کتابیں زمین پر گرادیں گی۔''

''اندھیرے میں چمگادڑ کی خوب سوجھی۔''

''اسلاف کی چھوڑی ہوئی کتابیں چمگادڑیں زمین پر گرادیں۔ اچھا نہیں ہوگا۔''

''کتابیں چمگاڈروں سے برباد نہیں ہوتیں بھائی۔''

قاسم اور اس کا محرر، صالحین دونوں داہر کے ہاتھوں کو چھو کر باہر جانے کی اجازت طلب کرنے لگے، داہر نے دونوں کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔

''باہر کرفیو سخت ہے، ڈھیل ملتے ہی چلے جانا۔''

''اب کبھی ڈھیل نہیں ملے گے، لوگ ملبوں سے نکل کر جارہے ہیں، ہمیں بھی نماز ادا کرنی ہے۔''

داہر نے بدقت تمام انہیں جانے کی اجازت دیدی، دروازے کا بولٹ کھول کر دونوں دھیرے دھیرے باہر آئے۔ باہر پھیکی پھیکی روشنی تھی، کرخت آواز ابھری۔

''ہاتھ اوپر۔''

دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اسی آواز کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہر دو چار مکانوں کے بعد انہیں ملبے نظر آئے اور ان ملبوں سے لہولہان لوگ نکلتے نظر آئے، جہاں کہیں سے بھی اذان کی آواز آرہی تھی وہاں مسجد ضرور ہوگی۔ ہزار ہا پل بیتتے چلے جارہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھائے اٹھائے کتنا لمبا سفر طے کیا۔ مگر ایک نقطہ بھی آیا جہاں انہیں آواز کا آخری سرا مل گیا۔ لوگ نماز کے لئے باجماعت کھڑے تھے اور سب کے ہاتھ اوپر اٹھے تھے۔

وہ دونوں بھی جماعت میں کھڑے ہو گئے مگر انہیں حیرت اس وقت ہوئی جب ان کے ہاتھ بھی اوپر سے نیچے نہ آسکے ——

☆☆☆

ترشنا

ایک میس (Mess) ایک کمرہ۔ کمرے میں چار آدمی۔ ایک اسکول کا اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر۔ عمر پچاس سے ذرا اوپر۔ ایک پرائیوٹ فرم کا سیلس ایکزیکیٹو، کوئی چالیس بیالیس سال کا۔ ایک ٹیچر ۳۵ برس سے کچھ زیادہ کا۔ ایک ایم۔ اے پاس بیکار نوجوان ...... ان میں سے کوئی بھی شادی شدہ نہیں۔ سب کے سب کنوارے۔ سب ایک دوسرے کے قریبی دوست۔

تو میس کے اس کمرے کی یہی Composition تھی۔ کنواروں کا یہ کمرہ کبھی غل غپاڑہ، کبھی اٹوٹ خاموشی اور کبھی سنجیدہ بحثوں کی وجہ سے چند مہینوں میں کافی پرکشش اور

دلچسپی کا باعث بن گیا تھا۔ سب سے پہلے پورولیا کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر نے اس کمرے کی پہلی چوکی بھاڑے پر لی تھی۔ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تنہا تھے، اسلئے کہ انکی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک چوکی اور سرہانے ایک چھوٹی الماری ہی کافی تھی۔ لیٹ کر پڑھنے لکھنے کی عادت تھی، لہذا رائٹنگ ٹیبل کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسکول کی سیل مہر بیگ میں ہی ڈال لیتے اور وہ بیگ سامنے کی کھونٹی پر لٹک جاتا۔ اسکول سے نمٹتے تو سیدھا اپنے کمرے میں پڑی کرائے کی چوکی پر آکر بچھ جاتے۔ کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ تکیہ کا غلاف دھلائی چاہتا ہے۔ بستر کی چادر سلائی چاہتی ہے۔ الماری کے تختے کھلے ہیں۔ چائے کی پیالی میں صبح کی چائے پتی پھول رہی ہے۔ صراحی میں پانی پرسوں کا ہے۔ اور اگر ختم نہ ہو تو اگلے ہفتے تک چلے۔ پنکھے پر بھی گرد کی صفائی ویسے بھی انکی ڈیوٹی میں شامل نہ تھی۔ لہذا اسکی صفائی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کلنڈر جولائی میں اگست کا مہینہ دکھاتا ہے۔ اور شاید انہیں کلینڈر دیکھنے کی عادت ہوتی تو پوتے پوتیوں والے ہوتے۔ ۵۰ سال تک کلینڈر نہیں دیکھا تو اب کیا دیکھیں گے۔ ان کے ۲۴ گھنٹوں میں کسی اونچ نیچ کی توقع بہت بڑا مطالبہ ہوگا ان سے۔ کلنڈر دن، تاریخ اور مہینہ بدل دے، سال پلٹ دے۔ لیکن وہ اپنی چوکی پر جوں کے توں بچھے رہیں گے.........

.........مگر جوں کا توں کوئی رہ سکتا ہے؟ کیسے رہ سکتا ہے۔ تو پھر یہ کیا اور انکی چوکی کیا! چنانچہ ایک چوکی اور بن چاہے ان کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ایک پرائیوٹ فرم کا سیلس ایکزیکیٹو تھا کوئی۔ دونوں کی چوکیاں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ ہیڈ صاحب اسے دیکھ کر پہلے تو ذرا جز بز ہوئے۔ پتہ نہیں کس قماش کا ہے۔ پٹے گی کہ نہیں۔ بھاشا کیا ہے......

کس دھرم کا ہے......

......نمشکار جی۔

کہیے کتنے دنوں کا ارادہ ہے؟

کہا نہیں جاسکتا......ایک سال، دوسال، تین سال......یا کل ملا کر تین دن بھی......

بائی دی وے آپ کا نام کیا ہے؟

جی مجھے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر پرکاش رائے کہتے ہیں۔

اور مجھے دھولیا کہتے ہیں۔ میری فرم کی نئی برانچ اس شہر میں کھلی ہے۔ سیلس ایکزیکیٹو

ہوں۔

میں یہاں کے اسکول میں پڑھاتا ہوں۔

بڑی خوشی ہوئی آپکو پاکر۔ ٹیچر برادری کے لئے میرے دل میں بڑا آدر اور سمان ہے۔

مگر کاروباری تو اسے ایک معمولی نوکر سے زیادہ اہم نہیں سمجھتے۔

مگر میں ان میں سے نہیں۔

آج تو سب کچھ ان پڑھ لوگوں سے چلتا ہے۔ بیچارے عالم تو میری طرح کسی کونے کسی چوکی پر ڈھیر ہیں۔ خیر، باقی باتیں بعد میں ہونگی۔ بستر وستر لگایئے۔ جب تک میں آپکے لئے چائے کا آرڈر دیتا ہوں۔

کوئی تکلف نہیں۔

پہلی چائے میری طرف سے۔ اے بابو دو کپ چائے لانا۔ کھاتے میں لکھ دینا۔

اب یہ بتاؤ کہ شادی شدہ ہو یا کنوارے

دونوں

مطلب؟

بیوی پہلی رخصتی سے پہلے ہی گذر گئی۔ مگر چائے سے اس کا سمبندھ ہے؟

اگر شادی نہیں ہوئی ہوگی تو پیالے کے ساتھ طشتری بھی ہوگی۔ شادی کے بعد چائے ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔

تو اب بابو سے طشتری لانے کو کہہ دیجیے۔

میری طشتری بھی اب تک پیالے کے ساتھ ہے۔

ہم دونوں ایک ہی تھان کے گز ہیں۔ صرف ناپ میں آپ ایک ذرا پہلے آتے ہیں۔

طشتری سمیت چائے کی پیالیاں آئی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے چہروں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ شاید مختلف اور مشترک کی چھان بین ہو رہی تھی۔ مشترک اور مختلف کی تلاش آدمی کی پرکھ کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ فقیر کے لئے خیرات۔

تو رائے صاحب کتنے دنوں سے اس کمرے میں ہیں آپ؟

یہی کوئی دو مہینے سے

بہت ہوتے ہیں دو مہینے۔ اس بیچ کوئی نیا کرایہ دار۔

میرے علاوہ آپ۔ اور کوئی نہیں۔ دیکھئے اور کون کون آتا ہے۔

کنواروں کا یہ کمرہ اور بھی کئی مہینے یونہی رہا۔ کسی تیسرے یا چوتھے نے گھاس نہیں ڈالی اسے۔ اکثر ایسی جگہ پر بڑے بیزار یا مصیبت کے مارے لوگ ہی آ کر قیام کرتے ہیں۔ ہیڈ صاحب خوش تھے کہ بھگوان نے لوگوں کو سکھی رکھا ہے ورنہ اس گودام نما کمرے کی دو خالی چوکیاں بھی بھر جائیں۔ ایکزیکیٹو کبھی کبھی ہیڈ کے کھاتوں کی بکھان سے بور ہو کر سوچتا کاش کوئی ایک اور کنوارا۔ یا کنوارا نہ سہی ایک شادی شدہ ہی آ جائے۔ گفتگو کی یکسانیت سے تو چھٹی ملے۔ ہیڈ صاحب تھے بڑے مخلص، ہمدرد، ضرورت میں کام آنے والے، مگر جب انکی ہیڈ ماسٹری کی بکھان شروع ہو جائے تو بس۔ آپ کان پر انگلی بھی نہیں رکھ سکتے۔ پاس ہمسائیگی جو آڑے آتی ہے۔ کل فلاں پیون کی بھرتی کے سلسلے میں ہیڈ صاحب، ڈپٹی صاب کے پاس گئے۔ پرسوں ماسٹر ہدایت اللہ کی گڑی ہوئی پنشن کو اکھاڑنے کی کوشش میں اکاؤنٹنٹ جنرل مغربی بنگال کی کھڑکیاں اور دروازے اکھاڑ آئے۔ ماسٹر چھیدی کی حاضری پر دو بار لال داغ لگائے۔ اور وہ انٹلکچول کا بچہ شیکھر ٹپکتی ہوئی چھت مرمت کرانے کے لئے بچوں سے انقلاب کی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے مسئلہ صرف ہمارا یا تمہارا ابھی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں سے کیسے نپٹا جائے جو ہر چھت میں کہیں نہ کہیں کوئی سراخ ضرور چھوڑ دیتے ہیں۔ سراخ کی مرمت سے زیادہ ضروری ہے چھت کی نئی ڈھلائی۔ پرانی چھت توڑ کر۔ بھڑکا رہا ہے بچوں کو۔ حالانکہ ہیڈ صاحب ہی اسے قبائلی علاقہ کے ایک لور پرائمری اسکول سے ٹرانسفر کرا کر اس اسکول میں لائے تھے۔ کیوں کہ وہاں بھی انکی ڈی آئی سے نہیں بنتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر روم کے بگڑے ہوئے حلئے کی درستگی میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک پیون کے اچانک انتقال پر انہوں نے اسکی بیوی بچوں کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے۔ کیا کیا لڑائیاں کیں ڈی آئی سے۔ ہمدردی کی بنیاد پر اسکی بیوی کو پیون میں بحال کرنے کی پرزور سفارش کی۔ ڈی آئی نے جو ذرا ٹال مٹول کی تو انہوں نے بات رائٹرز بلڈنگ تک پہنچوا دی۔ اور اسکول کا ہیڈ ماسٹر تو

انکے بنا آدھ انچ بھی نہیں ہل سکتا۔ وہ تو کیش بک اور لیجر کے الف بے سے بھی واقف نہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو بانکوڑا والا بدنام کیشیر اور ہاتھ لپک اکاؤنٹنٹ کب کے نگل گئے ہوتے ہیڈ ماسٹر کو۔ دراصل انکے آنے سے پہلے اسکول کا نظام ہی درہم برہم تھا۔ اب تو انہوں نے بوسیدہ اور مخدوش سیڑھیوں کو بھی درست کرا لیا ہے۔ البتہ ٹپکنے والی چھت ابھی تک ان کے دماغ میں ٹپ ٹپ کر رہی ہے۔ مگر بلڈنگ کا چارج پی ڈبلیو ڈی والوں کا ہے۔ انکی ناکردگی تو دنیا میں مثالی ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی شکایتی چھٹیاں پتہ نہیں کہاں جا کر رک جاتی ہیں۔ اب یہ کیس بھی انہی کو دیکھنا ہے۔ انکے ہیڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر پرکاش رائے اسکول کے سب ہی کچھ ہیں۔ بس ایک ہیڈ ماسٹر نہیں ہیں۔

ایک دن ایکزیکیٹو کی مراد برآئی۔ تیسری چوکی کی گود بھی ہری ہوئی۔ تقریباً ۳۰-۳۵ سال کا ایک کالج ٹیچر تھا وہ۔ سوشل سائیکالوجی پڑھاتا تھا۔ مگر اسکی نظر انسانی تمدن کی تاریخ پر بڑی گہری تھی۔ اور ٹکنولاجیکل انقلاب کا حامی بھی تھا۔ دھولیا اسکے نئے اپروچ سے بڑا متاثر تھا۔ اگرچہ کالج ٹیچر تاجر طبقے سے مطمئن نہیں تھا پھر بھی اس نے ایکزیکیٹو کو اپنے قریب پایا۔ ایک دن ایکزیکیٹو کالج ٹیچر سے بولا۔

"تم اکثر اسکول کے بعد چائے کی دکان پر اڈہ لگاتے ہو۔ تمہارے شاگرد کیا کہیں گے۔"

"اگر وہ واقعی میرے شاگرد ہونگے تو کچھ نہ کہیں گے دراصل ٹیچر کا روایتی تصور جو ہمیں پرکھوں سے ملا ہے وہ بڑا رسمی ہے۔ ادب و تعظیم کے غلط تصور کا خمیازہ ہم کب تک بھگتیں گے۔ ہمارا یہ یگ بے تکلفی کا ہے۔ اگر کل کی دنیا میں جکڑے ہوئے کچھ لوگ بندھنوں سے آزاد ہو کر بے تکلف نہ ہوتے تو شاید بہت ساری ایجادیں نہ ہوتیں۔ رسمیات او پچار کتا میں تخلیق اور تجسس کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔ ذہن کند ہو جاتے ہیں۔ میں تو اپنے شاگردوں کو بھی کبھی کبھار اس چائے میں شامل کر لیتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن انکی بے تکلفی جب بیہودگی بن جاتی ہے تو رام ہی بچائے ان سے۔"

"مگر میں صرف اپنے شاگردوں کی باتیں کر رہا ہوں۔" ۔ اتنے میں ہیڈ صاحب

داخل ہوئے اور کہا..........

..........''یہ لو چائے اور ختم کرو اپنا یہ فلسفہ!''۔

''یہ تو لازوال فلسفہ ہے۔ پرکاش جی اگر سے ملے تو اپنے فلسفوں پر ضرور غور کریں۔''

''کل مینیجر کہہ رہا تھا۔ کوئی اور اس کنوارے بلاک میں آنے والا ہے۔ چائے کا خرچ ایک بار پھر بڑھے گا۔''

''تو کیا ہوا ہم سب سنگل ہیں۔ ایک اور سنگل کو بھی سنبھال لیں گے۔''۔

ایک دن آخری خالی چوکی پر ایک بے روزگار ایم۔ اے پاس وارد ہوا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ بھی کنوارا ہے۔ گویا یہ بلاک اب مکمل طور پر کنواروں کا تھا۔ اس نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اس کے بعد بے روزگاری کا کارڈ لئے گھر گھر ٹیوشن پڑھاتا۔ بہر حال تینوں نے اس نوجوان کا زبردست سواگت کیا۔ اس نوجوان کے پاس مسائل تھے۔ اور وہ ہر وقت انکے حل کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ تینوں کو اس سے بڑی ہمدردی ہوگئی کیونکہ وہ اپنے مسائل کو تخلیقی سطح پر لیتا اور انہیں اپنی کویتا میں اس طرح ڈھالتا کہ تینوں دم بخود رہ جاتے۔ ایکزیکیٹو نے تو اس کے لئے پبلیشر تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لڑکے کی ایک نظم تھی..........

''بے روزگاری کی پہلی سالگرہ۔''

بے روزگاری تیری یہ پہلی سالگرہ ہے
۲۲ سال کی میری کمزور کمر پر تیرا بوجھ
اپنی پہلی تہہ جمارہا ہے
میں خوش ہوں کہ میرے بچے نہیں ہیں
ورنہ تیری ہر سالگرہ پر وہ تجھے اپنے آنسوؤں کا تحفہ نذر کرتے
میں شپت لیتا ہوں، قسم کھاتا ہوں کہ
اپنی بے روزگاری کی چھت کے نیچے
بچوں کو جنم لینے نہیں دونگا

میرے بچو! تم پیدا نہیں ہو سکو گے اپنی ہونے والی ماں کی
کوکھ میں !!

تو اب یہ گودام اپنے مکینوں کا کوٹہ مکمل کر چکا تھا۔ اس کنوار خانے کے چاروں کنوارے بہت ساری مشترک باتوں کے طفیل ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے۔ دن اچھے گذر رہے تھے۔ ہیڈ صاحب نے چائے، پانی، صفائی، استری کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا۔ بقیہ تینوں اپنی اپنی مرضی کے کام کیا کرتے تھے۔

ایک دن اس کنوار خانے میں زلزلہ آ گیا...... بم پھٹ پڑا...... بم باز تھے ایکزیکیٹو ڈھولیا جی۔ انہوں نے اچانک یہ خبر سنائی کہ وہ کسی نازک اندام کے عشق میں گرفتار ہوئے ہیں ۔ حالت نازک ہے...... ایمرجنسی میں داخل نہ کیا گیا تو شاید کچھ کا کچھ ہو جائے شادی کا فوراً انتظام نہ ہوا تو......؟ بہر حال یہ کیفیت لمحاتی رہی۔ تینوں خوش ہوئے کہ چلو ایک کا گھر بسا۔ مگر وہ سوچ رہے تھے۔ ۴۰ برس کے ایکزیکیٹو کا عشق اب شروع ہوا تھا۔ یہ عجیب و غریب واقعہ تھا۔ تینوں اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ہمارے ملک میں تو ۴۰ کے لوگ بہوئیں لانے کی سوچتے ہیں۔ مگر اسکی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ آخر وجہیں ہیں تب ہی نا بقیہ تینوں کنوارے ہیں۔ خاص کر ہیڈ صاحب۔ وہ تو پچاس پار کر کے بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے رشتہ ازدواج انکے یہاں ایک غیر ضروری شئے ہو۔ یا یہ انتہائی ذمہ داری والا فریضہ ہو جس کا سنبھالنا ہمہ شما کے بس کی بات نہیں ۔ اگر پتنی چولہے ہانڈی کی طرح لانی ہو تو ساری عمر کا کنٹریکٹ کیسا؟ چولہے کی آنچ ناپید اور ہانڈی میں چھید ہو جائے تو کتنا جبر سہنا پڑے گا ایک دوسرے کو۔ تو یہ جبر از خود کیوں مسلط کرے اپنے اوپر کوئی۔ مگر ایسے خیالات تو افزائش نسل کو روک دینے کے مترادف ہیں۔ اس سوال پر ہیڈ ٹھہا کے سمیت فرماتے ہیں.........

"بھائی مرغی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انڈا کس مرغی کا ہے۔ کس مرغے سے ہے...... اسکی پروا مرغی کو نہیں ہوتی۔ اسکے پیٹ کے نیچے جو بھی انڈا رکھ دو وہ سیتی ہے اور بچے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ بطخ کے انڈے بھی وہی سیتی ہے۔ ان بچوں پر کوئی چونچ مار کر تو دیکھے۔ تو افزائش نسل کہاں رک جاتی ہے۔ اور اب تو انڈے سے بچہ بنانے والی مشین بھی نکل پڑی ہے۔ تو مرغے، مرغی کی کیا ضرورت؟ ہم تو آدمی ہیں۔ ہمارے لئے تو...... ہاں

عشق تک بات ٹھیک ہے۔'' مگر ڈھولیا جی کی محبت شادی میں تبدیل ہونی تھی۔ اس بات کا اندازہ ڈھولیا جی کی ضد سے ان تینوں کو بخوبی ہو گیا تھا۔ فیصلہ غلط تھا یا صحیح۔ مگر تھا انکے ایک دوست کا ہی۔ اسے مان ہی لینا ہوگا۔ لڑکی کا اصرار بھی ہے شادی کے لئے ۔ وہ بہت خوبصورت اور لائق بھی ہے جیسا کہ ڈھولیا نے بتایا۔

تو شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ ایکزیکیٹو نے اس سلسلے میں نہ اپنے کسی رشتہ دار نہ گھر والوں سے مشورہ کیا۔ بس یہ تینوں ہی اسکے مشیر تھے۔ ان لوگوں نے جب اس مسئلے پر بات چیت کر کے ہری جھنڈی دکھا دی تو تاریخ مقرر ہو گئی۔ کورٹ میرج ہونا طے پایا۔ میرج رجسٹرار کے آفس میں چاروں گئے۔ اتفاق سے دلہن کے گھر سے بھی کوئی نہ تھا۔ دوستوں کی گواہی کام آئی شادی رچی۔ جوڑا اپنے کرائے کے سنگل روم فلیٹ میں داخل ہوا۔

اب کنوار خانے کی ایک چوکی خالی تھی۔ پتہ نہیں کون سا بستر بچھے اب۔ تینوں کمرے میں آ کر افسردہ تھے۔ شاید ایک کنوارے کے کم ہو جانے کی وجہ سے یا پھر ایک کے اضافے کی وجہ سے۔ اتنا گہرا سکوت اس کمرے میں کبھی طاری نہیں ہوا تھا۔ پچھلے ماہ و سال میں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ڈھولیا جی ہی باندھنے والی ڈور تھے۔ ان کے جاتے ہی وہ ڈور کٹ گئی۔ سب رابطے ٹوٹ سے گئے۔ ہیڈ صاحب اپنا معمول بھولنے لگے۔ ٹیچر کبھی کھانا کھانا بھول جاتا۔ بیکار نوجوان غسل کئے بغیر ہی ٹیوشن پر نکل جاتا۔ یا ناغہ کرتا۔ ان تینوں کو شاید اپنے اندر کی تبدیلی کی پروا بھی نہ تھی۔ تینوں اپنے میں گم صم اپنے دوست کی خوشحالی کی دعا کرتے۔ ان کے رشتے ہی ایسے تھے۔ غرض کی کوئی گانٹھ نہ تھی ان میں۔ ان کی بے نیازی میں بھی ڈھولیا کے لئے نیاز ہی نیاز تھا۔ اور ایسا اس وقت بھی آیا جب ڈھولیا نے آنے جانے کا سلسلہ تقریباً ترک کر دیا تھا۔

بہت دنوں بعد میس میں ایک دن یہ پیغام آیا کہ ڈھولیا نے تینوں کو اپنے گھر پر فوراً بلایا ہے۔ شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ خبر پاتے ہی تینوں ایکزیکیٹو کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچے۔ دیکھا ڈھولیا پتھر سا خاموش ایک ٹک دیوار سے ٹنگی تصویر دیکھ رہا ہے۔ اور فرش پر پانچ یا چھ ماہ کی بچی اوں، اوں کر رہی ہے۔ سارا منظر ساکن معلوم پڑ رہا تھا، کیونکہ ان کے پہنچ جانے کے بعد بھی ڈھولیا جیسے ہر شئے سے لاتعلق شادی کی تصویر میں کھویا تھا۔ آنکھیں بھیگی

ہوئی۔ ہونٹ کانپتے ہوئے۔ مٹھیوں میں کرسی کے ہتھے جکڑے ہوئے۔ تینوں اسکے اور تصویر کے درمیان دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے تو ڈھولیا نے آنکھیں جھپکائیں۔ تینوں کو سامنے پا کر بھبھک پڑا۔ جب آنسو برس کر بہہ گئے تو پتہ چلا کہ آج صبح جب اسکی آنکھ کھلی تو اسکی بیوی لاپتہ تھی اور ایک ایک خط تم تینوں کے نام میز پر پڑے تھے۔ پتہ نہیں کیا لکھا ہے۔ پڑھا نہیں کیونکہ میرے نام کوئی بھی خط نہیں تھا۔ تینوں نے اپنے اپنے نام کے خط اٹھائے۔

میرے مشفق، میرے سابق سرتاج......قدمبوسی

مجھے نہیں معلوم کہ یہ خط میں کیوں لکھ رہی ہو۔ لیکن یہ خط بہت دنوں سے لکھ رہی تھی۔ انتظار تھا کہ مکمل ہو تو آپ تک بھیجواؤں۔ مگر ایک عرصہ لگ گیا مکمل ہونے میں۔ ایک ساتھ تین تین چٹھیاں جو لکھ رہی تھی۔ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ ایک ساتھ تین تین چٹھیاں شروع کرنا اور ختم کرنا۔ اور وہ بھی ایک ہی موضوع پر۔ باتیں گڈمڈ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ایک ایک لفظ کو خطروں سے نکال کر کاغذ تک پہنچانا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ آپ تو مدرس ہی نہیں۔ ذمہ دار اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر بھی ہیں۔ آپ نے نہ جانے کتنے لفظوں کو خطروں سے گھرا دیکھا ہوگا۔ آپ کو ان خطرات کا احساس ضرور ہوگا۔ آپ نے انہیں ان خطرات سے نکالا بھی ہوگا۔ میں بھی خطروں سے گھری ایک لفظ کی طرح تھی۔ اور آپ نے مجھے اس خطرے سے نکال لیا تھا۔ یاد ہے نا کہ بھول گئے سر؟ جب میرے چاروں اور کوئی بھی نہ تھا صرف تیز و تلخ حسرتیں تھیں چہار طرف تو آپ سائبان کی طرح میری زندگی میں وارد ہوئے۔ آپ نے مجھ سے شادی ہی نہیں کی بلکہ مجھے سینچا۔ پروان چڑھایا۔ میری اور آپکی عمر میں کافی فاصلہ تھا۔ لیکن سائبان کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ اسکی تو لمبائی اور چوڑائی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے ہوتا ہے ایک نہیں، کئی سنسار کا سکھ۔ میں نے ہی اصرار کیا تھا شادی کے لئے۔ اور آپ نے میری خاطر مجھے قبول کر لیا تھا۔ کالج میں فائینل ایر میں تھی کہ ایک لکچرر کی قربت کا تجربہ ہوا۔ ۳۰۔۳۲ برس کا اپنے دانشورانہ احساس میں تپتا ہوا۔ گرم اور گرم جوش۔ میں پگھل گئی تھی۔ بھٹی کے لوہے کی طرح۔ آپ تو جانتے ہی ہیں سر زمانے کے سرد و گرم۔ آپکی حوصلہ افزائی نے مجھے لوہے کی طرح اٹل اور بے خوف بنا دیا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے اس لوہے پن کا امتحان بھی لیا تھا۔ اور کھری اتری تھی۔ موم کی طرح پگھل جانا میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ مگر بھٹی میں لوہا بھی گل

جاتا ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ آپ نے بتایا ہی نہیں۔ شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ کائنات میں آگاہیوں کا ڈھیر ہے۔ آپ کیا کیا بتاتے۔ مجھے اپنے طور پر بھی تو کچھ جاننا تھا سر۔ میری لاعلمی مجھے بھٹی میں لے گئی۔ میں پگھل گئی سر۔ بھولنے لگی آپکو۔ فنا ہونے لگی دھیرے دھیرے۔ اس نے مجھے دوسرا بنا دیا سر۔ اور آپ نے فراخ دلی سے مجھے معاف کیا۔ مجھے اپنی طرح جینے کے لئے آزاد کر دیا۔ اور میں سیال مادے کی طرح بھٹی میں ادھر ادھر ڈولتی رہی۔ میں پھولی نہ سما رہی تھی اپنی اس نئی صورت پر مگر......

آپکے چرنوں کی دھول

میرے معتمد...... میرے سابق رفیق حیات

ہزاروں آرزوئیں، تنہائیاں سب میری

خلوص دل، محبتیں سب تمہاری

تمہاری دانشورانہ بلندی نئے نظریے، نئی فکر سب نے ملا جلا کر مجھ پر وہ اثر مرتب کیا کہ میں نے اپنی زندگی کے پہلے مرد، پہلے محسن، پہلے شفیق کا دل توڑا اور تمہاری ہوئی، تمہاری بڑی بڑی سجاوٹی اور اخلاقی باتیں، کلمات پر معنی نے میرے اندر انحراف کی وہ قوت پیدا کی کہ میں نے بہت ساری سماجی روایتوں کو توڑا۔ نئے تناظر میں اپنی عملی حدوں کا تجزیہ کیا۔ تمہاری بیشتر باتوں میں مقناطیسی کشش کا احساس ہوا۔ اسی احساس نے بہت کچھ کروالیا مجھ سے۔ میرے تمام انحرافی عمل میں ایک چھوٹی سی بات تھی۔ یعنی شادی کے بعد بھی مانگ میں سیندور نہ ڈالا۔ میں نے بتانے کی ضرورت محسوس کی نہ تم نے کبھی پوچھا۔ کیونکہ تم نے انسانی رشتوں کی وہ نئی تعبیریں بتائی تھیں کہ پچھلے تمام رشتے غیر ضروری اور بے وقعت ہو گئے۔ لارشتگی ایک نئے رشتے کی صورت میں نمودار ہوگئی۔ سب رشتے اس میں غرق ہو گئے۔ مگر ایک دن اچانک تم نے بھی شادی کی تجویز رکھ دی۔ میں چونک پڑی تم تو ان سب باتوں سے اوپر اٹھ گئے تھے، مگر تم نے پھر ایک دانشورانہ تاویل پیش کی۔ یعنی سب کچھ جڑوں تک جب تک بدل نہ جائے اس وقت تک مصنوعی رشتے بے پناہ سماجی حمایت کی بدولت قائم و دائم رہتے ہیں۔ اور جب تک یہ رشتے سماجی حمایت سے محروم نہ کر دیے جائیں اس وقت تک یعنی عارضی طور پر ہمیں انہیں قبول کرنا ہی ہوگا۔ ہم دونوں کا ارتباط اگرچہ غیر مشروط ہے، پھر بھی وہ

ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، جہاں جسمانی تعلقات کا قائم ہونا بے حد ضروری ہے۔ فی الوقت سماجی نزاکتوں کی بناء پر شادی جیسا غیر ضروری فعل بھی ضروری معلوم پڑتا ہے۔ اور ہمیں ایک آگاہ نئی نسل پیدا کرنی ہے جسکے لئے تمہاری کوکھ کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر شادی جیسی فرسودہ روایت کو گوارہ کرو تاکہ نئی نسل لانے میں بے جا مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کتنی بڑی بات تھی۔ میری کوکھ کو تم نے کتنا عظیم بنا دیا تھا۔ یہ عظمت مجھ سے کھو نہ جائے اس لئے پہلی شادی کی بات میں نے تم سے پوشیدہ رکھی۔ تمہاری وسیع النظری اور وسعت قلبی کے پیش نظر میں نے سوچا وقت آنے پر سب کچھ بتا دونگی۔ کیونکہ پرانا چونچلا ہی سہی میں یہ جھ نہیں ڈھو سکونگی۔ جیسا کہ تمہیں معلوم تھا میں ان دنوں حمل سے تھی۔ تم نے آگاہ نسل کا پہلا بیج رکھدیا تھا میری کوکھ میں۔ سب کچھ بدل دیگا میری کوکھ سے جنم ینے والا۔ عظیم ماں کہلاؤنگی میں۔ مگر اپنی عظمت پر کبھی کبھی شبہہ ہونے لگتا کہ میں نے تم سے ایک بات چھپالی تھی۔ اگر یہ جھ میرے ذہن سے اتر جاتا تو شاید میں عظیم تر ماں بن سکی۔ امیں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا تم زمین پر ہو۔ کھڑے بھی نہیں بلکہ منہہ کے بل گڑے ہوئے۔ تم نے کہا تمہیں داغدار نسل نہیں چاہئے میں نے لاکھ کہا کہ یہ بچہ تمہارا ہے، صرف تمہارا مگر تم نہ مانے۔ تم نے شرط لگادی، حمل گراؤ یا واپس جاؤ۔ شرمندہ ہوں۔

آپکی خطا کار

ھمراز من!

خوشی آپکی باندی ہو!

شروع کر رہی ہوں اس دعاء کے ساتھ۔ کیونکہ جب ایم۔ اے میں تم میرے ہم جماعت تھے تو بیکار تھے۔ اب بھی نہ جانے کیا کرتے ہوگے۔ تم نے س میں مجھے ہمیشہ نمناک اور غمگین دیکھا۔ تم نے مجھ سے ہمدردی جتائی۔ مجھے کریدنے کی کوشش کی۔ یہ جاننا چاہا کہ اس بلکتی طالبہ کے بھیتر کیا کچھ جمع ہے جو لاوے کی طرح پھٹنا چاہتا ہے۔ مگر تم کامیاب نہ ہوئے۔ تم نے میرے ساتھ دردمندی اور خوش خلقی کی وہ مثالیں پیش کیں کہ میں ششدر رہ

گئی۔ اور میں نے کئی رشتوں میں ایک نئے رشتے کی ٹھنڈک محسوس کی۔ یہ رشتہ اس قدر گہرا ہوا کہ درمیان سے ایک ایک چیز ادنیٰ سے اعلیٰ سبھی گم ہوگئی۔ صرف ہم تم بچ گے۔ میں نے شادی کی تجویز رکھی۔ ہونے والے بچے کی بے آبروئی نہ ہو اسی غرض سے مگر تم بیکار تھے۔Stipend پر چلنے والی ایک بیکار سانس۔ تجویز سے رہی سہی ہوا بھی نکل گئی۔ تم پنکچر ہوگئے۔ بزدل۔ روزگار کو سب کچھ ماننے والا پتلا۔ بھلا بے روح پتلے میں آدمی کہاں ملتا مجھے۔ اسی لئے بنا کسی اطلاع کے میں اس شہر سے نکل آئی۔ یہاں میری ملاقات دھولیا سے ہوئی۔ جس کے گھر میں تم کھڑے ہو۔ مجھ سے ملنے کے بعد اس کا ایک ہی مقصد تھا مجھے خوش رکھنا۔ اسے ایک اچھی، نیک اور محبت کرنے والی بیوی چاہیے تھی۔ کورٹنگ کے دوران شاید اس نے مجھ میں وہ سب کچھ پالیا تھا۔ اس نے کورٹ میں بڑی سادہ لوحی اور سادگی سے میرے ساتھ شادی کی۔ اور مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ قسمت بھی کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ تم تینوں ایک ساتھ میری شادی میں گواہ ہوئے۔ اور تملوگوں نے اس وقت مجھ سے نا آشنائی کا وہ تاثر دیا کہ دنیا کے بڑے بڑے ایکٹر بھی فیل کر جائیں۔ تمہارے دوست دھولیا نے ہر طرح کا آرام دیا۔ میری اور وفاداری پر ذرہ برابر بھی شک نہیں کیا۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو بچی تمہارے سامنے ہے وہ تمہاری ہے، دھولیا کی نہیں۔ میں نے ایکزیکیٹو کو یہ بات نہیں بتائی۔ کئی بار سوچا کہ بتا دوں۔ میں اس نیک اور بھولے آدمی سے چھل کر رہی ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں ادھر کئی روز سے میں بہت پریشان رہی۔ کیا کروں۔ اب یہ سچ بڑا ہو رہا ہے۔ میں اس بڑے ہوتے ہوئے سچ کو دبا نہیں پاؤنگی۔ کیا کروں...... کیا کروں...... کوئی شئے ہے مجھ میں جو مجھے کہیں رکنے نہیں دیتی۔ جڑا رہنے نہیں دیتی۔ کیا ہے وہ شئی؟ میں کیوں نہیں رک پاتی کسی ایک جگہ؟ کسی ایک کے پاس۔ خالق دو جہاں نے کون سی مٹی ڈال دی ہے مجھ میں۔ میں اس بھولے اور نیک انسان کے پاس بھی نہیں رک سکی۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے جانا ہے۔ تم سب اپنے دوست کا خیال رکھنا اور میری بچی کا بھی۔

وہ جو کسی کی نہیں

دھولیا نے جب خود پر قا پالیا تو اسکی نگاہ بچی پر پڑی۔ وہ خاموشی سے بچی کے

پاس گیا اور اسے گود میں بھر کر گہری نگاہ سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پھر بھبھک پڑا...... تینوں دوستوں میں سے کسی ایک نے کندھے پر، کسی نے پیٹھ پر اپنے اپنے تسلی کے ہاتھ رکھ دیئے۔

بچی جواب تک جھن جھنے سے کھیل رہی تھی۔ جھن جھنا پھینک کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا نے لگی اور اوں، اوں کی آواز سے کمرہ بھر گیا۔

☆☆☆

پشت پہ رکھا آئینہ

اور جب
غلام فاتح ہوا۔
سب کے اپنے اپنے اختیارات قا میں آئے

اور جب
یقین کی چکی میں پس کر چور ہوئے تو پتہ چلا کہ
اس نے یا کسی نے بھی آئینہ دیکھنا گوارہ نہ کیا تھا۔
آئینہ میں محض انکی پشتیں جھانکتے رہے تھے

یہ......اور اس کے ساتھ سب کچھ آگے بڑھتا رہا تھا۔

ایک سے دو گھر۔ پھر ایک گھر میں کئی گھر۔ ایک کڑاھی میں سو سو ابال۔ ایک چھپر پر ہزار ہا لنگور۔ ایک تالاب میں بے شمار مچھلیاں۔ ایک آسمان میں کروڑوں پرندے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر سب کچھ آگے سرکتا رہا۔ سب کچھ آگے کی اور......

اچانک ایک دن......وہ پلٹ گیا

اسکی انگلیاں آئینہ پر تصور رہی تھیں۔ انگلیوں کے نیچے کی گرد چھٹ رہی تھا اور اب......

گرد کی اوٹ سے آئینہ نمودار ہو چکا تھا۔

داڑھی بے طرح بڑھ چکی تھی۔ بالوں کی لمبائی اور چھوٹائی میں کوئی تناسب نہ تھا۔ کبھی داڑھی میں انگلیاں غائب ہو جاتیں تو کبھی انگلیوں میں داڑھی —— عجیب بات تھی بالکل سامنے کی بات —— مگر تھی عجیب ہی —— کہیں سے پکڑ میں نہیں آرہی تھی۔ چہرے کے نام پر کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ محض داڑھی تھی یا پھر آنکھیں۔ رونے کو جی چاہا۔ پھوٹ کر روئے۔ روتے روتے گلا رندھ گیا۔ جب رونے کی سکت باقی نہ رہی تو اپنی انگلیاں دیکھی۔ وہ غائب تھیں۔ انگلیوں کی جگہ لمبے لمبے نوکدار ناخن۔ گویا اپنے ہی ناخن سے کرید کرید کر چہرے کو لاپتہ کرلیا تھا۔ اگر وہ اک ذرا اور نہ اور ناخن کو انگلیوں کی طرح استعمال نہ کرتا تو شاید اندھا بھی ہو جاتا۔ اور اسے یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ خود اس کے ناخنوں نے اس کا چہرہ کھالیا ہے۔

اسے اپنے ناخنوں سے نفرت ہونے لگی۔

''کیوں بھائی اتنا بڑا اسیلون (Saloon) کھول رکھا ہے۔ ناخن کاٹتے ہو؟''

آنے والی نسلوں کے لئے
اپنی جنبشوں سے
دراڑیں بناتا ہے
نسلیں دراڑوں سے ٹپکتی ہیں
نظمیں مکمل ہوتی ہیں

پر ہوتا کیا ہے
کچھ بھی تو نہیں

دورانوں کے درمیان......!
یہ عمل تب بھی جاری تھا۔
اب بھی جاری ہے......

ناخنوں نے اس کا چہرہ کھالیا ہے۔ ایمانویل جاچکی ہے
دھن مرتی نے اسکے ایک کاندھے پر کچی سڑکیں اور بیل گاڑیاں سوار کردی ہیں اور دوسرے کاندھے پر ''جاگوار'' اور، فاتم، Plant کردیا ہے۔ اور اس کا سر ان کے درمیان پھنسا ہے۔ وہ کچھ نہیں کرپارہا ہے۔ بیل گاڑی کا ہال اسکے کندھے کو لہولہان کررہا ہے۔ فاتم کی آوازیں اسکے کانوں کے پرنچے اڑائے دے رہی ہیں۔ آئینے کے ایک کونے سے گر دھتا کر ایک جلوس ابھر کر سامنے آگیا ہے۔

باچتے گئے لے لوڑتے ہوبے
لوڑتے گئے لے باچتے ہوبے
(بچنے کے لئے لڑنا ہوگا۔ لڑنے کے لئے بچنا ہوگا)

ارے! یہ کیا؟ دھن مرتی کی لاش ٹانگے پھر رہا ہے یہ جلوس! بالکل ننگی، چھاتیاں لٹک رہی ہیں۔ رانیں تھل تھل کررہی ہیں۔ گردن پھندے میں پھنسی ہے۔ زبان بالشت بھر باہر جھول رہی ہے۔ ایمانویل بھی ایسے ہی مری تھی۔ وہ رہا؟ اس کا چہرہ ٹھیک لاش کے پیچھے۔ ہاں بالکل اسی کا چہرہ۔ ناک بھی وہی خوبصورت سی۔ تو پھر اس آئینہ کے باہر کون ہے؟

''صاحب! آپ اتنی دیر سے آئینہ دیکھ رہے ہیں۔ کتنے گراھک واپس ہو گئے ایک بار کہدیا نہ۔ ناخن نہیں کٹے گا۔ شیو کرائیے یا بال کٹوائیے۔''

''بال نہیں کٹے گا۔!''
''تو پھر۔؟''
''ناخن۔''
''نہیں صاحب نہرنی تیز نہیں ہے۔''

''کب تیز ہوگی''

''اب شاید کبھی نہیں''

''کیوں؟

''اس لئے کہ اب لوگ اپنے ناخن بیویوں سے کٹواتے ہیں۔ آ گیا ہے نہ ان کے پاس Nail Cutter بڑی بڑی دیسی بدیسی کمپنیوں کا''

''مگر جنگلی بیویاں نہیں ہیں''

''شاید آپنے دیکھا نہیں کہ یہ Hair Cutting Saloon ہے۔ یہاں بال کٹوائیے داڑھی بنوائیے اور چلے جائیے۔ کہیے تو کھینچ دوں۔ کافی بڑھ چکی ہے۔''

مگر اب اس کے پاس چہرے کے نام پر داڑھی ہی بچ گئی تھی۔ انہیں بھی کاٹ لیں تو کیا بچے گا۔ اس نے ایک بار پھر آئینے کو غور سے دیکھا۔ کہاں گئی وہ ناک۔ خوبصورت ناک۔ وہ یاد کرنے لگا اسکی ناک کہاں کہاں اور کس کس سے ملتی تھی۔ سراج الدولہ سے۔ ٹیپو سے۔ لارڈ کلائیو سے۔ ماؤنٹ بیٹن سے۔ گاندھی سے۔ جناح سے۔ چیگ سے۔ ایک بار میشل ایمینول نے اسکی ناک پر طویل نظم لکھی تھی۔

ناک!

تیرے اندر بوئے وفا سونگھنے کی قوت نہیں

تو کتوں کے نتھنوں پر ہی ٹھیک ہے

(تم سب اپنی اپنی ناک ہٹا کر وہیں فٹ کرلو)

ناک تمہارے لئے اس سے مناسب جگہ۔ کوئی دوسری نہیں

تیرے اندر بوئے وفا سونگھنے کی قوت نہیں۔

اور اسکے آگے ڈھیر ساری باتیں تھیں۔ مگر جب غلام فاتح ہوا تو یہ نظم ڈائری کے صفحات سے ہجرت کر گئی۔ اب تو وہ ناک بھی باقی نہ رہی۔ کتنا اچھا لگا اسے جب یہ نظم یاد آئی۔ مشیل ایموئیل بھی یاد آئی۔ نظم کے مصرعے۔ دونوں مصرعے ہتھیلی سے دبائے، دلارے، دبوچے اور پھر اپنا نام دھنسایا اور رانوں کے بیچ نظم مکمل ہوگئی۔

دو رانوں کے بیچ خلاء

خلاء چوسنے اور چاٹنے کا عمل
عظمتوں کی نشاندہی کرتا ہے
ارے ہاں گردن!
آئینے سے ایک Highway ٹپک پڑا
وہ دھیرے دھیرے سیلون سے باہر ہوا
جلوس بھی اسی Highway پر روانہ ہوا
کبھی جلوس آگے
کبھی Highway آگے
اور ——— وہ؟
اب تک کی رپورٹ کے مطابق وہ ——
استرے سے اپنی گردن اتارنے میں مصروف ہے۔

☆☆☆

شب زاد

وہ تنک مزاج بھی نہ تھا، مگر اپنے ہی گھر میں کئی طرح سے مشہور تھا۔ جیسے یہی ایک بات اسکی تنک مزاجی کی۔ بڑی بوڑھیاں اسے یہ کہکر دعاؤں میں شامل کر لیتیں کہ تنک مزاج سہی مگر من کا کڑا تو نہیں۔ یہ بات اسکے کانوں تک بھی پہنچی۔ پھر وہ اپنے مزاج کا آپریشن کرنے بیٹھ جاتا۔ آخر مزاج کی یہ تنک کیا چیز ہے۔ اور وہ تنک اس کے مغز کا ہی حصہ کیوں بنی۔ بے شمار غیر ضروری کھوپڑیاں خالی پڑی تھیں۔ مگر کیسے، کس اوٹ سے یہ شئے داخل ہوگئی اس میں۔ اسے یقین تھا کہ ایسا ہونے میں خود اس کا اپنا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اس نے خود اپنی کھوپڑی کے دروازے میں کوئی ایسی آنکھ نہیں بنائی تھی جس سے باہر کی کرچیاں اندر داخل ہو جاتیں۔ پھر؟ وہ اپنے بچپن کی طرف بھاگتا ہے، اپنے گاؤں کی طرف بھاگتا ہے۔

وہاں کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ سب ہی سچ تھا۔ گھر کے سامنے مالدہ آم اور دالان کے

ایک کونے میں کھوں کھوں، کرتے بڑے ماموں۔ دونوں کو کچھ نہ کچھ چاٹ رہا تھا۔ ماموں کے کلیجے کو دق کا کیڑا اور مالدہ آم کے پیڑوں کو دیمک۔ دیمک زدہ پیڑ۔ دق زدہ آدمی۔ ٹھیک گھر کے سامنے یہ دو باتیں ہو رہی تھیں۔ اور دونوں کے درمیان ایک بے طبیب دوری یا نزدیکی۔ اور جب پیڑ بے پھل اور آدمی بے کلیجہ ہو گیا تو دونوں ہی منظروں کی چوحدی سے لاپتہ ہو گئے۔ پرانے پیڑ کی جگہ ایک ایسا پیڑ لگا دیا کہ جس میں نہ کبھی پھل آئے اور نہ کبھی دیمک چاٹے۔ اور وہ خود پیٹ میں کارن دبائے مولی صاحب کی سنیچر کا استقبال کرتا۔ کسی طرح اردو کے ہجے اور قرآن شریف کے سترہویں پارے تک پہنچ گیا۔ گھر کی پشت پر ایک بڑا سا پوکھر۔ قدرت کا کارخانہ۔ جس میں دھان گیہوں اور مکئی کی فصلیں ڈھلا کرتی تھیں۔ اس کارخانے کے دو کناروں پر انکی بستیاں جو اس کارخانے کو ایندھن مہیا کرتی تھیں۔ ہر صبح ان بستیوں سے چھ آنے والا زنانہ اور بارہ آنہ والا مردانہ جن جھٹکے ماموں ہانک کر لے جاتے اور شام کو کھلیان بوجھوں کی چھلیوں سے بھر جاتی۔ آخری مرحلے میں مالک بھی آ جاتے۔ معائنہ بھی ہوتا اور چہرے پر من بھر کی ہنسی اٹھائے واپس ہو جاتے کہ سب کچھ ٹھیک تھا۔ سب کچھ سچ تھا۔ سچ یہ بھی تھا کہ مئی جون کی گرمیوں میں اطراف کی بستیوں سے ہیضہ زدہ لاشیں بڑی خاموشی سے مالک کے کھرول میں جلائی جاتیں۔ راتوں میں کھرول سے اٹھنے والے شعلے ہم بچوں کے لئے آسیبی کرامات تھے۔ کہاں کون جیتا ہے، کہاں کون مرتا ہے، اسکی فہرست شاید ہی کہیں بنی ہو۔ مالک کا دبدبہ۔ ماموں کی شفقت، اور اماں کی پس اندازی۔ سب کچھ ٹھیک پھر یہ تنک مزاجی......؟

بچپن کی طرف بھاگ کر آنا غلط ہی تھا، وہاں تو سبھی سچ تھا۔ یہاں تک کہ خود وہ بھی۔ زندگی کی پہلی کروٹ شاید سبھی کے لئے سچ ہو۔ دوسری کروٹ کی تفصیل محض قصہ تحصیل ہے۔ مگر بورا کمزور ہو تو زیادہ بھرائی سے پھسک جاتا ہے۔ اس تفصیل میں ایک ایسا ہی بورا اور ایک بڑا تاریخی شہر شامل ہے۔ بورا کمزور تھا۔ اس لئے زیادہ بھرائی اس میں نہ ہو سکی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس بورے میں تیز نوک والی چھری داخل ہو گئی۔ بورے کے پیٹ سے نوک باہر نکل آئی اور سارا شہر لہولہان ہو گیا۔ ماں بھی شہر میں تھی۔ بہن بھائی سب ہی شہر میں تھے۔ پیٹ سے جھانکتی ہوئی نوک بھی انکے علم میں تھی۔ ماں نے اس نوک کو کبھی موضوع بحث نہیں بنایا۔

بس کہا کہ کچھ دبلے نظر آتے ہو۔ کھانا وقت پر اور ٹھیک سے کھایا کرو۔ بڑے بھائیوں نے اس نوک سے ہونے والے بھیانک انجام کی طرف کبھی اشارہ نہیں کیا۔ چھوٹے بھائیوں نے جو کچھ تھا، اس کا احترام کیا۔ کیونکہ یہ سب کچھ سچ تھا۔ نوک بھی سچ تھی۔ باپ اور مولوی صاحب نے اسے اور اس کے اپنوں کو سچ دبانا نہیں سکھایا تھا۔

مگر ایک دن یہ کروٹ بے چین ہوگئی۔ کسی نے نوک کو پیٹ میں دھنسا کر اوپر سے سلائی کر دیا تھا۔ اور اب وہ نوک شہر سے غائب ہو کر بورے کا پیٹ مجروح کرنے لگی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ بورے کی سلائی کاٹ کر وہ نوک پھر باہر نکالے اور شہر کے تسمہ پیروں کو تراش کر اس کے حوالے کرے۔ مگر سینے والے نے پٹوے کی ستلی کی جگہ گھوڑے کا بال استعمال کیا تھا، شاید وہ درزی نہیں، ماہر جراح تھا۔ جس نے بورے پر نہ ٹوٹنے والی ترپ لگائی تھی۔ جب نوک پیٹ کے اندر گھاؤ بنانے لگی تو وہ تلملا اٹھا۔ سچ بھی جھوٹ ہوگیا۔ ماں نے پھر کہا سب ٹھیک ہے۔ کھانا وقت پر کھایا کرو۔ صحت کا خیال کرو۔ مگر اسکی پیٹ میں ڈبکی لگاتی نوک؟ ماں سچ نہیں تج پاتی۔

اور پھر تیسری کروٹ عجیب کروٹ۔ سچی بھی۔ جھوٹی بھی۔ میٹھی بھی کڑوی بھی۔ بورے سے کچھ خالی کرنے کی خواہش۔ بورے میں کچھ اور بھرنے کی خواہش۔ نوک خنجر کا پیٹ میں پاگل کیچوے کی طرح چلنا۔ سہ طرفہ ٹکراؤ۔ اور پھر اس نے اپنی دو سال کی بچی کی زبردست پٹائی کی۔ بلاوجہ رونا۔ غیر ضروری سچ۔ ماں نے پوتی کو پچکارا، وہ چپ ہوگئی۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب تنک مزاجی اس میں داخل ہوگئی تھی۔ مگر وہ حتمی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ تیسری کروٹ میں حسب خواہش ملازمت بھی در آئی تھی۔ میٹرو پولیس میں یہ ادنیٰ سی شئے بھی بہت کچھ سلب کر لیتی ہے۔ مثلاً ہفتے کے چھ دن۔ اس کے ایک Colleague نے اتوار کا Over-time لینے سے اس لئے انکار کرتے ہوئے اپنے صاحب سے کہا تھا کہ ان سات دنوں میں ہی ایک دن ایسا ہے جس دن وہ چھٹی میں اطمینان سے بیت الخلاء میں بیٹھ کر اچھی باتیں سوچتا ہے۔ اور باقی چھ دن ملازمت کی حفاظت کرتے گزارتا ہے۔ صاحب نے اسے سخت ڈانٹ پلائی تھی۔ کاش کہ اس دن پیٹ کا خنجر باہر ہوتا۔ گھر آ کر اس نے اپنی تین سال کی بچی کی دھواں دھار پٹائی کی تھی۔ اب وہ ہر سچ کو پیٹ پیٹ

کرادھ مرا کردینا چاہتا ہے۔ اس دن ماں نے سر میں تیل دیکر اچھی خاصی مالش کی تھی۔ لڑکا جھنک گیا ہے۔ کام بھی تو بھاری ہے۔ پہلی پڑھائی بھی کتنی بھاری تھی۔ بہو روتا ہوا بچہ سامنے سے ہٹا لیا کرو رات کی اولاد بڑی رونی ہوتی ہے۔ یہ بھی بہت روتا تھا مگر دیکھو کتنی بھاری پڑھائی پڑھ گیا۔ اس کے باپ اسے ولایت بھیجنا چاہتے تھے مگر...... یہ بھی سچ ہے کہ وہ ولایت نہ جاسکا کہ اپنے شہر میں ہی وہ ولایتی ہو گیا تھا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اور بزرگ اسے واقعی دعاؤں میں رکھتے تھے۔ اسکی ترقی ہو۔ ان کے لئے یہی سچ کافی تھا کہ وہ ایک اچھی سی ملازمت پر مامور تھا۔ حالانکہ اس ملازمت سے کسی تیسرے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ ماں اب گاؤں میں رہنے لگی تھی۔ آخری عمر میں اسے آم کا دیمک زدہ خوشبودار درخت اور بڑے ماموں کی کھوں کھوں بہت یاد آنے لگی تھی۔ روز حشر میں جاگنے کے لئے اس نے اپنی مٹی پر ہی لیٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنی مٹی سے وفاداری کی حمایت میں یہ ماں کا دوسرا فیصلہ تھا............

مولوی صاحب، مسجد اور سامنے کا قبرستان، میری مٹی۔ گنڈک کی باڑھ آئے گی تو کیا ہوگا ان کا۔ میرے گاؤں کی مٹی باڑھ بہا کر دوسرے گاؤں لے جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر ہو کیا نہیں سکتا ہے۔ کبھی کبھی چاہا نہیں ہوتا اور ان چاہا ہو جاتا ہے۔ پر میں یا کوئی ہوتا کیوں ہے؟ اسی لئے نا کہ باڑھ کو روکے۔ باڑھ کو روکنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی باندھ باندھ کر کبھی DAM اٹھا کر۔ اور یہ سب کس لئے؟ اس لئے نا کہ اپنے گاؤں کی مٹی اکھڑ کر دوسرے گاؤں نہ چلی جائے۔ اپنی زرخیزی دوسروں کا نوالہ نہ بن جائے۔ تو بھاگ جانے سے باڑھ نہیں رکتی۔

ماں پھر شہر نہیں لوٹی۔ اسکے بچے بھی گاؤں ہی میں رہنے لگے کہ اسے روتا ہوا بچ برداشت نہ تھا اور ماں بھی اسکے قریب نہ تھی۔ چھٹی میں جب وہ گاؤں گیا تو بیوی نے اطلاع دی کہ چار سال کی اسکی وہ بچی بہت شریر ہو گئی ہے۔ ماں اسکی شرارتوں کو دلارتے ہوئے کہتی ہیں......"

"بیٹی باپ پر دھاپ جمائگی! اور اس نے بیوی کو یہ کہکر چپ کر دیا کہ وہ آغاز تم سے کریگی۔ کیونکہ ہر کام ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے۔ اور پھر ماں روز حشر کو جاگنے کے لئے اپنی امرود بانی والی زمین کے قریب ہی لیٹ گئی۔ دفن کرنے والوں میں قرب وجوار کے لوگ

ہی نہیں ان کے آنسو بھی شامل تھے۔ وہ اس سچ کے لئے تیار نہ تھا۔ پر اس نئے سچ کے ساتھ ہی وہ بال بچوں سمیت شہر چلا آیا۔

وہ تنک مزاج بھی تھا جیسا کہ معلوم ہوا۔ مگر...... ایک دن اسکی وہ بچی کسی بات پر ضد کر بیٹھی۔ اس نے اسے جھڑک کر ٹال دیا۔ اور صبح کی چھپی ہوئی لاچار خبروں پر جھک گیا۔

اچانک اسکی پیٹھ میں کوئی نوک چبھتی چلی گئی...... ''ارے ارے یہ کیا۔'' اس کی ماں چیخ رہی تھی...... چھری کہاں لئے جا رہی ہے۔ ہاتھ کٹ جائیگا۔'' ادھر وہ اسکی پیٹھ پر چھری سے گھاؤ بناتی چلی جا رہی تھی۔ بیوی دوڑ کر آئی اسکے ہاتھ سے چھری چھین لینا چاہا۔ ''کمبخت باپ پر چھری چلاتی ہے۔ جان سے مار دونگی۔'' اس نے بیوی کو روکا۔

''چلانے دو اسے چھری۔''

''کیا کہتے ہو۔''

''ہاں دیدو چھری اسکے ہاتھوں میں۔''

''نہیں...... یہ کھیل اچھا نہیں۔''

''یہ کھیل نہیں ہے۔ چھوڑ دو اسے چلانے دو چھری۔''

''پاگل ہو گئے ہو کیا۔''

''اگر آج رک گئی تو بہت برا ہوگا۔''

''کیا برا ہوگا؟

''وہی جواب تک ہوا ہے۔ وہ چھری اس کے پیٹ میں داخل کر دی جائیگی۔ اور ساری عمر اسکی نوک اندر کو گھاؤ بناتی رہیگی۔''

''یہ تمہارا پاگل پن ہے اور کچھ نہیں۔''

''مت روکو اسے چھوڑ دو پلیز۔''

بیوی نے اسے ہاتھ میں چھری سمیت چھوڑ دیا، مگر ساتھ ہی گھونسے اور تھپڑوں کی برسات شروع کر دی۔ بچی مار کھا کر گہری نیند سو گئی تب...... بیوی بولی: ''دیکھا اپنی باون بیر بیٹی کو۔ کیسی سخت مار کھائی۔ پر ایک قطرہ آنسو کا نہ نکلا۔ اسکی کہیں کی۔''

وہ بولا: رات کو جنم لینے والی ہر اولاد رونی نہیں ہوتی۔

☆☆☆

کانٹی نیوٹی

ایک صبح وہ باتھ روم کے آئینے کے روبرو تھا۔ بھوترے بلیڈ سے اپنی داڑھی کھکھورنے میں مصروف —— اسکی داڑھی کا بھی عجیب قصہ تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے اس نے اپنی مونچھ چھوڑی تھی۔ مجھے اسکی وہ مونچھ بے حد غیر ضروری لگی اور اس حد تک غیر ضروری کہ جب میں نے اسے دیکھا تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ جواباً وہ بھی قہقہے مار کر ہنس پڑا۔ وہ بغل میں Tape Carton دبائے ہوا تھا۔ شاید اسٹوڈیو سے ابھی ابھی باہر آیا تھا۔ میرے ساتھ ایک غیر ملکی فلم ایکٹریس اور ڈائرکٹر تھے۔ ایکٹریس جس کا انٹرویو لیا جانا تھا، ہم دونوں کے قہقہوں کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے مسکرانا بھی تھا۔ ایکٹریس جو ٹھہری۔ اس

کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ سچویشن دیکھے۔ تبھی Re-act کرے۔ ڈائرکٹر کی آنکھیں ڈانوا ڈول تھیں۔ اس نے شاید ایسا سچوئشن کمپوز ہی نہ کیا ہو۔ خیر مجھے ہنسی اس بات پر نہیں آئی تھی کہ اچانک اسکی مونچھ کیوں اگ آئی تھی۔ ہنسی اس بات پر آئی کہ وہ اپنی عمر کا وہ حصہ نہ چھپا سکا جس میں وہ داخل ہو چکا تھا۔ میں نے جب پوچھا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے اس اسٹوڈیو میں کام کر رہا ہوں۔ آپکو کبھی مونچھوں سمیت نہیں دیکھا۔ یہ اچانک؟

اس نے جواب دیا "Continuity" ہے۔

"Continuity"

ہاں Continuity شوٹنگ چل رہی ہے

وہ باتیں تو کر رہا تھا، مگر پکڑ نہیں پا رہا تھا خود کو۔ اس شوٹنگ نے اسے کتنا باہر کر دیا تھا۔ جتنی زمین اس نے اپنے لئے جتائی تھا، پاؤں اس سے باہر نکل گئے تھے۔ جیسے جوتے کا upper پھٹ جائے تو انگوٹھا باہر نکل آتا ہے۔ جوتے کے upper کی طرح اپنے upper کو چمکاتے رہنے کا فن اسے آ گیا تھا۔ وہ فنکار تھا، آرٹسٹ، جو حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ بھول جاتا ہے کہ وہ اسی دنیا میں ہے۔ جہاں سورج روز نکل کر روز ڈوب جاتا ہے۔ ہر چیز اسکی گرمی پا کر پھیلتی ہے، سکڑ جاتی ہے۔ جوتے یا آدمی کے اپر میں پھیلنے سکڑنے سے بھانج پڑ ہی جاتا ہے۔ اور ایک دن اپر سے انگوٹھا باہر آ ہی جاتا ہے۔

غیر ملکی اداکارہ انٹرویو دے چکی تھی۔ انٹرویو کے دوران وہ ایک بار پھر اسٹوڈیو جھانکنے آیا تھا۔ مگر اس وقت بھی میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس نے جھٹکے سے اسٹوڈیو کا دروازہ بند کر دیا۔ عجیب Continuity عجیب تسلسل ہے۔ ہنسی کے جھٹکے ہی لگتے جاتے رہے ہیں۔ اب جب میں اسے دیکھتا ہوں تو ڈیڑھ سال کی رفاقت کی continuity ٹوٹ جاتی ہے۔ اسکی کھچڑی مونچھ میرے اندر ہنسی کی بارود بھر دیتی ہے اور وہ بارود اسے دیکھتے ہی جیسے......!

سب چلے گئے تو وہ میرے کمرے میں آیا (میں پھر ہنسا) ایک سگریٹ سلگائی۔ پھر مونچھوں پر انگلیاں پھیریں اور بولا: آپ تو مہینہ بھر دفتر سے باہر رہے فلم فیسٹول کے چکر میں۔ ادھر میری مونچھیں آپے سے باہر ہو گئیں۔ اگر آپ انہیں دھیرے دھیرے Grow کرتے دیکھتے تو شاید آپ کے اندر جو ہنسی کی بارود بھری ہے، وہ Charged نہ ہوتی۔ دراصل

ہم لوگ اچانک کے عادی ہو چلے ہیں۔ زندگی پاؤں پاؤں چلے تو ہمیں ہنسی آتی ہے نہ رونا۔ اور اچانک کچھ ہو جائے تو وہ گہرا اتر جاتا ہے۔ چاول کی کوٹھی کی طرح بھبھک پڑتے ہیں۔ مگر ہم ایکٹر Continuity کے پابند ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے فلسفے بیان کر رہا تھا، تب بھی میرے ہونٹوں پر ہنسی کی لہریں آتی جاتی رہیں۔ وہ کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ مگر میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ خوش تھا یا ناراض، کیونکہ جس تسلسل کو وہ جی رہا تھا (اس وقت) نہ جانے اس میں ناراضگی یا خوشی جیسے جذباتی عمل کا دخل بھی تھا کہ نہیں۔

ہماری ملاقات کلامندر سے شروع ہوئی تھی۔ کوئی ڈراما دیکھنے گیا تھا میں شاید ''جنگل میں کھلنے والی کھڑکی'' اس نے ایک ادھیڑ عمر عیاش تاجر کا رول چنا تھا اپنے لئے۔ خوب تالیاں بجی تھیں اس کے ڈائلاگ پر۔ اسٹیج کے ۲۵ یا تیس برس کے تجربے نچوڑے دے رہا تھا وہ اس ڈرامے میں، مگر درشکوں کی ساری ہمدردی اس نوجوان غریب مگر خوبصورت ریسرچ اسکالر کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ (وہ غریب نوجوان اس ڈرامے کے اخراجات برداشت کر رہا تھا) جس نے تاجر کی غیر موجودگی میں اسکی کم عمر بیوی کے ساتھ ہم بستری کی۔ اور اسے آزاد ہونے کی خواہش بخشی۔ اور جنگل میں کھلنے والی کھڑکی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں اس ڈرامے کے کتنے شو ہوئے مگر درشکوں کی ہمدردی اسے کبھی نہیں ملی، جس کا وہ مستحق تھا۔ تالیاں ضرور بجیں۔ تالیاں جیسے اسکی اداکاری پر نہیں، بلکہ اسکی اسٹیج کی زندگی کی سلور جبلی پر بج رہی ہوں۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ تمہارے رول کے لئے جس Aristocracy کی ضرورت تھی وہ تم میں نہیں تھی۔ بلکہ ساری Aristocracy اس غریب نوجوان کا کردار ادا کرنے والے اداکار میں تھی، مگر اسے اصرار تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا۔ اس نے کہا کہ اب وہ کسی خاص رول کا انتظار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے اسٹیج کی زندگی کے سلور جبلی سال میں ہے۔ وہ اپنے لئے کہانی سے اپنا رول خود ہی منتخب کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسے کوئی Dictate نہیں کر سکتا۔ اس نے عیاش تاجر کی زبردست ایکٹنگ کی ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ تالیوں کی ریکارڈنگ کو Play-back کر سکتا ہے۔

تم سرکاری ملازم ہو۔ پرانی Continuity کے قیدی۔ جبکہ ہر فلم کے ساتھ اپنی Continuity نئی ہو جاتی ہے۔ میں نئی نئی فلمیں لیتا ہوں اور تم پرانی پرانی باتوں کو دہرانے

کے عادی۔''

پھر میں نے اسے ٹین کی تلوار میں نیزے سے انگریز فوجی افسر کا پیٹ پھاڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اسکی آنکھوں میں وہ دہشت نظر نہ آئی۔ جو پیٹ میں نیزے گاڑتے وقت ایک باغی کی آنکھوں میں ہونی چاہیئے۔ بلکہ فوجی افسر کی آنکھو میں وہ تمام باتیں تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ انگریز جب اسے پھانسی پر لٹکا رہے تھے تو ڈرامے کی ہیروئن کی ہمدردی اس کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ بڑی بددلی سے دو چار پھول اسکی ارتھی پر پھینکتی ہے۔ وہ بھی ڈائرکٹر کے حکم پر۔ میں نے پھر ٹوکا کہ یہ رول ...... اس بار اس نے بڑی سختی سے بات کی ...... ''تمہاری مداخلت کی عادت نہیں جاتی۔ ہماری رفاقت کی عمر اتنی لمبی نہیں جسے ہم ختم نہ کر سکیں۔ میں نے کئی بار کہا کہ میں اپنی مرضی کا خود مالک ہوں میں اپنے لئے جو پسند کرتا ہوں، وہی کرتا ہوں۔ تمہاری مرضی بے معنی ہے۔ تمہیں اختیارات بھیک میں ملتے ہیں اور وہ بھی چھین لئے جا سکتے ہیں۔ اور میں نے رائے زنی کے اختیارات تمہیں کبھی نہیں دیئے۔ مجھے جو کچھ ہونا ہے ہو جاؤنگا۔ میں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ کیا ہونا ہے۔ کیسا ہونا ہے۔ میں نے خدمت کی ہے اسٹیج کی، فن کی۔ اس کے عوض ملے ہیں مجھے یہ اختیارات کہ میں جیسا چاہوں اپنے لئے رول چن لوں۔''

بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ اب اسے اچھی اچھی فلمیں اچھے اچھے ڈائرکٹروں کے ساتھ ملنے لگی ہیں۔ اب فلموں والے اسٹیج آرٹسٹوں کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ اور وہ ایک لمبی شوٹنگ کے لئے لوکیشن پر گیا ہوا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ Location سے لوٹ آیا ہے اور اپنے گھر میں ہی اسیر ہے۔ کہیں باہر نہیں نکل رہا ہے۔ اور جب میں اسکی خیریت دریافت کرنے اسکے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہ باتھ روم کے آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ لمبی لمبی کھچڑی داڑھی بھوتھرے بلیڈ سے کھرچ رہا تھا۔ گھر میں ویرانی برس رہی تھی۔ اس کا اپنا چہرہ بھی بے رونق ہو رہا تھا۔ اسکی لمبی لمبی داڑھی دیکھ کر مجھے پھر ہنسی آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا کر رہے رہو۔''

جواب دیا ''کانٹی نیوٹی'' صاف کر رہا ہوں۔''

''بھابی اور بچے؟''

''معلوم نہیں۔ دو روز سے گھر پر ہوں، ان کا اتہ پتہ نہیں۔''

''گھر پر بالکل تنہا ہو۔ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں بالکل تنہا۔ اکیلا۔''

''کہاں رہے اتنے دن؟''

''اس بار ایک اچھی فلم مل گئی تھی۔ لوکیشن شوٹنگ پر گیا ہوا تھا۔''

''جاتے وقت بچے کہاں تھے۔''

''وہ سب یہیں اسی گھر میں تھے۔''

پھر؟

''اس بار Unit والوں نے بڑی اچھی Treatment دی۔ میرے رہنے سہنے کا بندوبست بھی ہیرو ہیروئن کے اور سائڈ ہیرو، ہیروئن کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر Take کے دوسو روپے کی ادائیگی۔ فلم کی ہیروئن نے تاکید کی تھی کہ اس بار کی شوٹنگ کے پیسے اپنی بیوی کو دینا۔ سو وہ پیسے میں لیکر آ گیا۔ ایک ادھیلا بھی خرچ نہیں کیا۔ شراب بھی ڈائرکٹر نے پلائی۔ مگر دیکھو وہ سب ——

وہ جب تک اپنی آدھی داڑھی صاف کر چکا تھا

میں نے اسے پھر گھورا۔ وہ سٹ پٹایا۔ بولا۔ بس اتنے ہی پیسے ملے تھے۔

تین دن کی شوٹنگ میں ہی حصہ لیا تھا۔

مگر

مگر کیا پوری فلم میں تین Appearance ہے۔ سائڈ ہیروئن کا باپ ہوں فلم میں۔ بالکل Extra۔ پتہ نہیں Editing میں کیا کچھ باقی رہے۔ سائڈ ہیروئن کے باپ کی کیا حیثیت ہوتی ہے، کہانی میں لیکن خود کو ایکسٹرا مان لینے میں کیا قباحت ہے۔ ایکسٹرا تو ہوں ہی۔ اور کتنی پالش کروں اپنے اوپر۔ سچ مان لینے میں کیا ہرج ہے۔ اسی لئے تو اب یہ Continiuity کھرچ رہا ہوں۔ نقلی کام کے لئے اصلی داڑھی کی کیا ضرورت۔ کیا ضرورت ہے ایک ایکسٹرا کو اس تسلسل کی۔ اس کا کہیں بھی تو کوئی سلسلہ نہیں بنتا۔ نہ فلم میں نہ کہانی میں۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، اسکے Upper میں شگاف پڑ گئے تھے اور پاؤں کی ساری انگلیاں باہر ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

نصف بوجھ والا قلی

ڈبے کے سارے مسافر سو رہے تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سفر میں آئی ہوئی نیند بڑی انمول ہوتی ہے۔ کھلی ہوئی کھڑکیاں شاید نیند کو اور بھی گہری اور مزیدار بنا رہی تھیں۔ مگر میری آنکھوں نے نہ جانے کیوں، نیند کی مخالفت میں، ایک لمبی رات کے تین پہر کاٹ دیے تھے۔ اور یہ رات کی آخری پہر تھی۔ ہوائیں شائیں سائیں کرتی آنکھوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ نیند کی امید کی بچی کھچی کائی بھی پگھل کر بہی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کئی اسٹیشن گذر گئے پر اتنی تیز ہوا کھڑکیوں سے نہیں آئی۔ لگتا ہے اسٹیشن جو چھوٹ گیا وہ کوئی بڑا جنکشن تھا۔ اور کوئلے والا انجن وہیں بدل گیا۔ کیونکہ اب نہ وہ چھک چھک کرتی تھی اور نہ رفتار میں دھیما پن۔ غیر معمولی رفتار سے بھگا لے جانے والا انجن بالکل بے آواز لگ رہا تھا۔ کیا سدا ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی بڑا جنکشن درمیان میں آجائے تو انجن ہی بدل جائے۔؟ اور کسی کو گونگے

انجن کی آمد کی خبر ہی نہ ملے۔ اگر تیزی سے کٹتی ہوئی پٹریوں کی آواز نہ ملتی تو شاید میں یہ سمجھتا کہ اتنی لمبی گاڑی بغیر کسی انجن کے گھسٹ رہی ہے۔ جب کٹتی ہوئی پٹریوں کی آواز بہت اونچی ہونے لگی تو میں نے اٹھ کر دو تین کھڑکیوں کے شیشے گرا دیئے۔ باقی سب ویسے ہی چھوڑ دیے۔ ممکن ہے دوسرے مسافروں کی نیند شیشوں کے گر جانے سے متاثر ہوتی کہ ٹوٹی ہوئی نیند اور چھوٹے ہوئے دوست کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پھر لوٹے یا نہ لوٹے۔ کتابوں کے اوراق کے درمیان اگر کسی الٹ پلٹ کے کارن اپنی زندگی کے اوراق آ جائیں تو جیسے آنکھیں کیچ سے آلودہ ہو جاتی ہیں۔ اور جاگی ہوئی آنکھوں پر سونے کی مہر لگ جاتی ہے۔ پھر سامنے کا سب کچھ بیکار ہو جاتا ہے اور ٹٹول ٹٹول کر جاننے کا آرٹ لاچاری اور بے بسی کی دلیل۔

میری بے بسی یا لاچاری تو بس اپنے برتھ سے اٹھ کر Toilet تک جانے کے بیچ کی تھی۔ اگر Toilet تک پہنچ جاؤں تو آنکھوں کی کیچ چپکے سے انگلیوں کے پور پر اتر آئے۔ مگر ایک خدشہ! انگلیوں کے پور پر پسری ہوئی کیچ کہیں اتر کر سارے ڈبے میں نہ پھیل جائے۔ کہیں ایسا ہو گیا تو ہم سب کتنے لت پت سے لگیں گے۔ ہونہہ، تو جو کچھ میری سوچ میں داخل ہو جائے وہی ہوتا ہے کیا؟ کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہاں...... وہی ہوتا ہے اور کبھی کبھی جیسے وہ سب ہوتا ہی نہیں جو میری سوچ میں داخل ہے۔ اب یہ ڈبہ، یہ مسافر، یہ شیشے، یہ کھڑکیاں، ڈبے کے بھاگنے کی رفتار...... سب ہی میری سوچ کی گرفت میں ہیں۔ پر کیا یہ واقعی؟ اس سوال کے تناؤ سے کچے پکے دھاگے ٹوٹنے لگتے ہیں۔

کھڑکیوں سے باہر پتہ نہیں کیا کیا بھاگ رہا ہوگا۔ کون کون پیچھے چھوٹتا جا رہا ہوگا۔ یہ جاننا مشکل ہی ہے کہ ان کھڑکیوں سے باہر جھانکا نہیں جا سکتا۔ ہواؤں کی سنسناہٹ، پہیوں کی خطرناک پھسلن، برتھ پر سو جاؤ تو پورے سفر کا دباؤ، تلووں، گھٹنوں، کمر، پیٹھ سے گذرتا ہوا دماغ کے اندر جیسے گولے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر ایک عجیب سی چھٹپٹاہٹ اور بے چینی۔ سنا ہے کہ ایسے گولے بننے سے پہلے ہی پھٹ جاتے ہیں یا پھوڑ دیے جاتے ہیں۔ تو پھر یہ پھٹے ہوئے گولے دماغ میں داخل کیوں ہوتے ہیں؟ شاید اس ڈبے میں میں نہیں بلکہ سوالیہ نشانات سفر کر رہے ہیں۔ تناؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بقیہ ڈبوں میں بھی یہی صورت حال ہوگی۔ مگر اس ٹرین میں تو Air Conditioned Coach بھی ہیں۔ وہاں

تناؤ کم ہوگا۔ یقیناً کم ہوگا کہ وہ بقیہ ڈبوں سے مختلف ہیں۔ دوسری طرف سے آنے والی ٹرین اس دباؤ کو تناؤ میں بدل دیتی ہے۔

ایک بار پھر مخالف سمت سے آنے والی گاڑی کپکپا دینے والی رفتار سے گزر رہی تھی۔ اب فیصلہ یہی تھا کے جو بھی اگلا اسٹیشن ہو وہیں اُتر جایا جائے۔ گھڑی کو کان کی طرف لے گیا۔ ٹک ٹک کی آواز بھی گم تھی۔ مگر اب اُسکی بھی پروانہ تھی کہ یہ وقت ریل سے اُترنے کا نہیں۔ لوگ ریل ایسی پکڑتے ہیں کہ انہیں رات بھر اترنا نہ پڑے۔ اور جب اترے تو دیکھیں کہ سامنے دھوپ بھی اتر آئی ہے اور منزل بھی۔

بریک کا دباؤ پہیوں پر ایسا پڑا کے سب کچھ جیسے ایکدم رک گیا۔ اور میں اپنے کئے ہوئے فیصلے کے مطابق۔ وہیں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اگر چہ صبح قریب تھی مگر تاریکی کا پڑاؤ اب بھی باقی تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے قبل ہی مجھے لانے والی تیز رفتار گاڑی پلیٹ فارم سے سرک گئی۔ اور جب پیچھے مڑا تو اسکی چھوڑی ہوئی سنسناہٹ سے کنپٹیاں گرم ہوگیئں۔ دیکھنے کی جو بھی حد ہوسکتی تھی اس کے پاس یا دور پلیٹ فارم ہی پلیٹ فارم دکھائی پڑتا تھا۔ کئی بار آنکھیں ملیں کہ شاید پلیٹ فارم کے آگے کچھ اور نظر آجائے مگر...... پلیٹ فارم پر شیڈ لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا تاریکی کے چھٹنے تک کسی شیڈ کے نیچے کسی خالی بنچ پر اپنا بوجھ اتارا جائے۔ اور خود کو کھول کر پھیلایا جائے۔

ایک بوڑھا قلی جسے شائد نیند نہ آنے کا مرض تھا؛ میرے بوجھ کے پیچھے لگ گیا۔ قلی پر پیسے خرچ کرنے کا ارادہ بلکل ہی نہ تھا کہ یہاں بس یونہی اتر گیا تھا۔ تناؤ سے بچنے کے لئے۔ لیکن پھر میں نے سوچا یہ قلی اپنے پلیٹ فارم کی ہر اینٹ کو پہچانتا ہے۔ اس سے بڑی مدد ملیگی۔ اگر وہ معمولی اجرت پر تیار ہو جائے۔ بہر حال اسکی ضرورتوں کو میرے اندر چھپے بیوپاری نے پہچان لیا۔ بات طے ہوگئی کے وہ میرا آدھا بوجھ ڈھوئے گا۔ اور دو روپئے کی جگہ محض ایک روپئے لیگا۔ وہ ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ اس کے دوسرے تمام ساتھی سو رہے تھے۔ اور جب سب سوئے ہوئے ہوں تو بند مٹھی کھلوا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ ہم دونوں سامان کے ساتھ قریب دکھنے والے شیڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب بنچ کے قریب پہونچے تو کسی کے پھنکارنے کی آواز ملی۔ میں سہم گیا۔ بوڑھا قلی مسکرایا۔

''یہ ازدہے کی پھنکار نہیں ہے سوری بابو کا خراٹا ہے۔''

''کون ہیں یہ سوری بابو؟''

''یہ یہاں کے بہت بڑے زمیندار ہیں کسی گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت دنوں سے وہ گاڑی نہیں آئی ہے۔ اس انتظار میں وہ اپنا گھربار کھیت کھلیان سب کچھ چھوڑ چکے ہیں۔ اب مستقل پلیٹ فارم پر رہ رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا پالتو ہاتھی انہیں آکر دیکھ جاتا ہے۔ پر یہ اسے دیکھنے نہیں جاتے۔''

''کیوں؟''

''یہ راز انکے اور ہاتھی کے درمیان ہے۔ وجہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ ہاتھی کا مہاوت بھی۔''

''تو کیا اس بنچ پر بیٹھنے کی اجازت دیں گے زمیندار صاحب'' ''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آیئے دوسرے شیڈ میں چلتے ہیں۔ یہ بنچ بھی Engage ہے۔ ہاں اس پر بانسری بابا براجمان ہیں۔ اب تھوڑی ہی دیر میں اٹھ کر بانسری بجائیں گے۔ سورج اپنے پاؤں پسارے گا۔ اور بھور ہو جائیگی۔ جب تک بابا کی بانسری نہیں بجتی' کوئل نہیں کوکتی۔ ہاریل اپنے پر نہیں جھاڑتے، ساہل اپنے کانٹے نہیں پھیلاتے، سورج پاؤں نہیں پسارتا۔ بھور نہیں ہوتی۔ بابا کی آنکھیں بند ہیں۔ بہت بڑے کلاکار ہیں۔ مگر اس پلیٹ فارم کو نہیں چھوڑتے۔ شاید بابا سے کسی نے ربر اسٹامپ پر لکھوالیا ہے، کہ وہ دو چیز نہیں چھوڑیں گے۔ یہ پلیٹ فارم اور بانسری ۔اور اگر بابا اسے چھوڑ دیں گے تو دن رات کا کیا ہوگا۔ سنا ہے کہ ان سے پہلے بھی ایک بابا تھے۔ اک تارا والے بابا۔ وہ بھی اسی پلیٹ فارم پر رہا کرتے تھے۔ مگر شاید ایک صبح انکی گاڑی آگئی وہ چلے گئے۔ مگر بھگوان کی لیلا اپرم پار شام کی گاڑی سے بانسری والے بابا اتر پڑے۔ بہت بڑے بانسری وادک ہیں بابا۔ انکو تکلیف دینا مناسب نہیں حالانکہ قانوناً بینچ پر چار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ آیئے آگے والے شیڈ میں چلیں شاید وہاں کوئی بینچ خالی ہو۔''

آگے والے شیڈ میں بھی بنچ خالی نہ تھا۔ چار پانچ بکسوں سمیت ایک موٹا آدمی اس پر پسرا ہوا تھا۔ قلی اسے دیکھ کر جیسے کانپ گیا۔ بولا...... ''صاحب یہاں بات نہ کرو۔ کہیں نیند ٹوٹ گئی تو آفت ہو جائیگی۔ دو بار اسکی نیند ٹوٹی تھی۔ دونوں بار دو اسٹیشن ماسٹروں کی بدلی ہوگئی۔

پتہ نہیں اسکے بکسوں میں کیا ہے؟ جب بھی نیند ٹوٹتی ہے کچھ نہ کچھ بدل دیتا ہے۔ یہ ہمیشہ گاڑی کا انتظار کرتا ہے۔ مگر اسے گاڑی کبھی نہیں ملتی۔ چھوٹ جاتی ہے اور پھر رات یہیں پلیٹ فارم پر سو جاتا ہے۔ اسے کوئی جگاتا نہیں۔ بانسری بابا کی تان ہی اسے اٹھاتی ہے۔ یہ بہت بڑا ہے صاحب۔ یہاں سے نکل چلئے دو ایک شیڈ اور بھی دیکھ لیں۔" دونوں آگے بڑھے۔

"یہ لیجئے اس شیڈ میں کچھ امید تھی وہ بھی جاتی رہی۔ دو تین کنگالی سوئے ہوئے ہیں بینچ پر۔ انہیں اٹھانا فضول ہے۔ یہ کسی کی نہیں سنتے۔ اپنی کرتے ہیں۔ دھر پکڑ ہوتی ہے تو ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ مگر بنچ مسافروں کے قبضے میں شاید ہی آتا ہے کہ انکی برسوں کی بیٹھک سے بنچ پر میل کی اتنی تہیں جم گئی ہیں کہ اب بنچ کی جگہ میل ہی میل باقی ہے۔ دوسرے مسافر اس پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے سوچا اگر خالی ہو تو شاید آپ پسند کریں بیٹھنا اس پر۔ کیوں؟ وہ اس لئے کہ آپکو بیٹھ جانے کی شدید خواہش ہے۔"

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ پلیٹ فارم پر ہی کیوں......؟

سوال بہت گمبھیر ہے۔ میں بھی کبھی کبھی یہی سوچتا ہوں۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میں خود کب سے پلیٹ فارم پر ہوں یا کب آیا تھا، کیسے آیا تھا یہاں۔ ایک ہی چیز یاد رہ گئی ہے "بوجھ" اور اس کے عوض چند سکے۔ پیٹ اور پھر وہی بوجھ۔ میل چھوڑ جانے والے یہ لوگ بھی نہ جانے کب سے اس لمبے پلیٹ فارم کی کہانی میں شامل ہو گئے ہیں۔ آج ۳۰ - ۳۲ سال سے ہر رات حیرت زدہ کرتی ہے۔ یہ کہانی کہیں ٹھہرتی ہی نہیں۔ ہر رات کچھ اور ہی لمبی ہو جاتی ہے۔ بانسری بابا والا ہی قصہ لے لیجئے۔ ان کے آنے سے پہلے مجھے اور دوسرے لوگوں کو بھی لگا کہ شاید اب یہ کہانی یہیں ٹھہر جائیگی مگر رات کے آتے آتے کہانی نے پھر بڑھنا شروع کیا اور پھر پھیلتی ہی چلی گئی۔

تو تمہاری اس کہانی میں ریل کے پٹریاں، ڈبے اور انجن شامل نہیں؟ نہیں کہانی میں یہ شامل نہیں ہیں۔ بلکہ کہانیاں ان کا انتظار کرتی ہیں۔

کہ وہ خود ان میں شامل ہو جائیں۔

"بات بہت دلچسپ کرتے ہو۔"

بات نہیں، کہانی دلچسپ ہے

میرا سوال تو وہیں رہ گیا۔ یہ لوگ پلیٹ فارم ہی کیوں؟

وہ اس لئے کہ یہ سب بے ٹکٹ ہیں۔ یہ اکثر پلیٹ فارم پر ہی رک جاتے ہیں۔ انہیں کبھی کوئی گاڑی نہیں ملنے والی۔ بس چمکتی پٹریوں پر اپنی آنکھیں چلا کر تشفی کر لیتے ہیں۔

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ اب آخری شیڈ دیکھ لیا جائے۔ چلئے۔

"معاف کرنا بوجھ سے تمہاری کمر اتنی جھک جائیگی معلوم نہ تھا۔ تمہیں خواہ مخواہ تکلیف دی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ کام تو کرنا ہی ہے۔ دن میں تو بوجھ جوان قلیوں میں بٹ جاتا ہے اسی لئے رات کے مسافر پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔"

یہ چلتے چلتے رک کیوں گئے قلی؟

اب مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ روشنی بھی کم ہے۔

تو پھر اتار دو سامان۔

نہیں نہیں۔ اتنا باقی بوجھ بھی مجھکو دیدیجیے

——لیکن——!

لیکن ویکن کچھ بھی نہیں۔ پیسے کی فکر مت کیجئے۔ ایک ہی روپیہ لونگا۔

"پر ایک روپیہ میں پورا بوجھ ڈھونا اور وہ بھی جبکہ تمہاری کمر۔ آخر کیوں؟"

جواب نہ دیکر اس نے بڑی تیزی سے میرا بوجھ جھپٹ لیا اور پھر اسے سر پر رکھ کر چلنے لگا اور جب آخری شیڈ کی روشنی بہت قریب آگئی تو میں نے دیکھا کہ اس قلی کی جھکی ہوئی کمر سیدھی ہوگئی تھی اور وہ تن کر چل رہا تھا۔ میں نے متعجب نظروں سے اسے گھورا۔ اس سے قبل کہ اس سے کوئی سوال کرتا۔ وہ بول پڑا......

"تعجب کی کوئی بات نہیں صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ میں آدھا بوجھ ڈھونے کا قایل نہیں!!!"

☆☆☆

پہاڑ ٹوٹ رہا ہے

ہمارے سروں پر پہاڑ ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے...... شاید سب نے محسوس کیا تھا کہ ہمارے سروں پر پہاڑ ٹوٹ رہا ہے۔ صرف پہاڑ ٹوٹ رہا ہے؟ کیا اسکے نیچے ہمارے سر نہیں ٹوٹ رہے ہیں؟ عجیب اوٹ پٹانگ سے چھوٹ رہے ہیں۔ خیالوں کے پٹاخے۔ دھم، دھما دھم۔ دھم مگر یہ خیالوں کے پٹاخے نہیں ہیں۔ یہ تو سچ مچ کے پٹاخے ہیں جو پہاڑ توڑنے کے کام آتے ہیں۔

ابھی ابھی میرے دفتر کا چپراسی چلاتا ہوا میرے کمرے میں گھسا تھا۔

''صاحب کچھ ہو رہا ہے ہمارے سروں پر۔ ٹھیک دفتر کی چھت جہاں ختم ہوتی ہے۔''

اسکے اوپر اوپر کچھ ہو رہا ہے۔ پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔ نیلے نیلے شعلے لپک رہے

ہیں۔ نہ جانے کیا کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا ہونے والا ہے ہمارے سروں پر۔ میں نے اسے ڈھارس بندھائی۔ ''چل کر دیکھتا ہوں ماجرا کیا ہے۔''

دفتر کی تین منزلیں طے کر کے چوتھی منزل پر پہنچا تو میں نے بھی محسوس کیا کہ کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ ٹھیک میرے سر پر کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ روشندان سے شعلوں کی لپک صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے اوپر بھی لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ اپنی پانچوں انگلیاں سر پر پھیریں۔ سر سلامت تھا۔ دراصل ترتیب جسم میں سر سب سے اوپر ہوتا ہے۔ اسلئے خطرات بھی اسکے لئے زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ہیڈ آفس سے دریافت کیا جائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے سروں کے اوپر کیا ٹوٹ رہا ہے؟ کیوں ٹوٹ رہا ہے۔ اس توڑ پھوڑ کا سرچشمہ کون ہے؟ میرے سوالات یونہی رہ گئے۔ جواب نہ دیکر ہیڈ نے پیغام بھیجا کہ وہ بھی کئی دنوں سے اس انتشار کو محسوس کر رہا ہے۔ اچانک کہ آہستہ آہستہ کیسے ہوئی شروعات اسکی، فی الحال بتانا مشکل ہے۔ چھان بین ضروری ہے۔ میں نے اپنے معمار اعلی کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس بات کی تہہ تک اترے اور بتائے کہ ہمارے سروں پر کیا ہو رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے۔ مگر سر پر ہی ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے سروں پر کچھ ٹوٹ رہا ہے کہ ہم خود چیخ رہے ہیں۔ ہیڈ نے امید دلائی کہ رپورٹ جلد ہی آجائیگی۔

میں بڑی بے چینی سے رپورٹ کا انتظار کرنے لگا۔ چپراسی، میں اور میرا ہیڈ اور باقی سب کے سب۔ اپنے اپنے سروں پر ٹوٹتے جانے کا خوف لئے خود کو کہیں محفوظ کر لینے کی دھن میں لگے تھے۔ سامنے سیڑھی کے جو کونا ہے میرا چپراسی بار بار وہیں جا کر چھپتا ہے۔ لفٹ مین کیبن سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ ہیڈ نے تعمیری ونگ کو حکم دیکر بڑی جلد بازی میں اپنی چھت کے نیچے موٹی موٹی سیلنگ منڈھوالی تاکہ ٹوٹنے کی آوازیں ان میں جذب ہو کر فنا ہو جائیں۔ سر کسی جوکھم میں نہ پڑے۔ ان مراعات خصوصی کے لئے میں Entitled نہ تھا۔ کیونکہ میں ہیڈ سے صرف ایک انچ کم تھا۔ ایک انچ کی کمی ہماری ہائیرا کی میں کبھی کبھی ایک صدی کا بعد بھی پیدا کر دیتی ہے۔ میں ایسے ہی ایک بعد کا شکار رہا۔ بات کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سر پر کچھ بکھرنے کچھ ٹوٹنے کا مرحلہ برابر جاری رہا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ دھماکہ ہو گیا ہے اور ہم سب ملبے کے نیچے دفن ہو گئے ہیں۔ دفن ہونا دنیا میں کوئی نئی بات نہیں ہے مگر آدمی کا

کھونٹے کی طرح ماٹی میں دفن ہونا بڑی بھیانک بات ہے۔ کتنے دو ہتھوڑ پڑتے ہیں کھونٹے کے سر پر تو کیا ایسا ہو رہا ہے کہ ہمارے سروں پر جو بچاؤ کیلئے آہنی چادر تنی ہے اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں؟ ممکن ہے وہ چوٹ سہتے سہتے ٹوٹ پڑے۔ پھر وہ ہتھوڑا ''O!No'' میں بہت زور سے چیخ پڑا۔ پھر جو لوگ بھی چھپے چھپے سے تھے، سب کے سب باہر نکل آئے۔ اور میرے کمرے میں جمع ہوئے۔

''کیا ہوا؟ کیسی چیخ تھی، کوئی مرا تو نہیں۔''

''سب ٹھیک ہے نا۔ سر دبا کر دیکھو۔ سر سلامت ہے کہ نہیں۔'' میں پھر چیخا......

''نہیں نہیں، رک جاؤ۔ سر سلامت ہے مگر سنو...... آواز سنو۔ دھم دھما دھم ٹوٹ رہا ہے نا۔ ہم سب کے اوپر کچھ۔''

سب نے نگاہیں اوپر اٹھائیں چھت ویسی ہی کی ویسی ہی تھی۔ مگر چوٹیں پڑنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

''صاحب کچھ ہونے والا ہے۔ کل میرے گھر میں بھی یہی آواز تھی حالانکہ وہاں کوئی چھت نہیں۔ ہمارے سر کے اوپر جھونپڑی ہے۔ مگر اسکے باوجود سر پر کچھ ہو رہا ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے بچوں نے یا بیوی نے بھی یہ آواز سنی ہے کبھی۔''

''میں نے ان سے دریافت نہیں کیا۔ مگر وہ لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ صبح کو ان سے پوچھنا بھول گیا۔'' ''اف! اوہ! تم لوگ ہر بات نامکمل، ادھوری چھوڑ دیتے ہو۔ بھلا یہ بات بھی بھولنے کی ہے کہ سر پر مسلسل چوٹیں برس رہی ہیں اور ہم سب اسے بڑی خاموشی سے برداشت کئے جا رہے ہیں۔''

''صاحب کیا بتائیں...... بیوی بچے میرے بے سر پیر کے ہو گئے ہیں۔ انہیں کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا اور میں انہیں بتا بھی نہیں سکتا کہ میرے اور آپکے سروں پر کیا گزر رہی ہے۔''

''جاؤ، جا کر پناہ گاہوں میں چھپ جاؤ۔ اب سب بیکار ہے۔ اسے ٹوٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

پھر میں نے اپنا سر دونوں پیر کے گھٹنوں کے درمیان گھسا لیا اور میز سے ٹک گیا۔

میں قریب نیم بیہوش تھا کہ ہیڈ بھاگے بھاگے نیچے آئے۔ کان کے قریب آوازیں لگائیں۔ پانی چھڑکا، مجھے ہوش سا آنے لگا۔ ''کڑ کڑ کڑ کڑاک۔'' پھر کچھ چٹخا۔ میں کرسی سے اچھل کر ہیڈ کے قدموں میں آگرا، میں بہت پریشان تھا۔

''کیا ہوا سر؟ رپورٹ آئی۔''

''آگئی۔''

''حقیقت کیا ہے۔''

''Confidential ہے۔''

''میں مرجاؤنگا۔ اب اوپر کی چھت تڑخنے ہی والی ہے۔ آپ رپورٹ کو خفیہ رکھکر میری جان لینا چاہتے ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ رپورٹ حقیقت سے آگے کچھ نہیں بتائی۔ حقیقت وہی ہے جو ہم تم اور اس دفتر کے سب لوگ جانتے ہیں۔'' یہ سنکر میرے ہاتھ پیر پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ بے ہوشی دوبارہ طاری ہونے لگی۔

رپورٹ وہی تھی جو میں نے اس نے اور سب نے محسوس کیا تھا۔ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ رپورٹ نے شبہے کی گنجائش نہیں رکھی، حالانکہ اب تک جتنی رپورٹیں اخباروں میں شائع ہوئی تھیں۔ ان میں شبہہ کی گنجائش بہر حال رکھی گئی تھی۔ مگر یہ رپورٹ اس قدر مدلل اور واضح ہے کہ شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ کاش کہ رپورٹ میں درج حقائق مشکوک ہوتے تو میں انہیں ذہنی سکون کی خاطر اپنے مطابق Interpret کر لیتا۔ رپورٹ سے وہی اخذ کرتا جنکی مجھے ضرورت تھی۔ مگر اس قدر واضح اور مرصع رپورٹ آج تک میری نظروں سے نہیں گزری۔ میں اس ٹھوس رپورٹ کا مارا ہوا ہوں۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بند ہوگئیں میری آنکھیں، کچھ توقف کے بعد کھل گئیں میری آنکھیں۔ میں سپیرے کی پٹاری میں بند ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میرے اوپر کوئی چیز نہیں ٹوٹ رہی ہے۔ ڈراونی آوازیں بھی غائب ہیں میں ریشم سا چکنا اور بانس کے کونپل سا لچیلا ہوں۔ مجھ پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا کیوں کہ انگلی رکھتے ہی میں سرک جاتا ہوں، اسکے نیچے سے۔ اگر انگلیوں کے بیچ کسی نے دبانے کی کوشش کی تو سرک کر شائیں سے باہر نکل آؤنگا۔ مجھے کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ میرے سر پر پٹاری کی وفادار

کمانیاں انئت پہرہ دے رہی ہیں۔ میں محفوظ ہو گیا ہوں۔ مجھے رقص کرنا چاہیے۔ ہاں میں رقص کر رہا ہوں۔ بین بج رہا ہے۔ میں رقص کر رہا ہوں۔ میری گردن اب ایکدم باہر آ گئی ہے۔ بین اچانک خاموش ہو گیا ہے۔ سپیرے نے ٹھٹھوا دبا لیا ہے۔ میری سانس حلق میں پھنس گئی ہے۔ میرے زہریلے دانت آپس میں پھنس گئے ہیں۔ ریشمی دم ہوا میں شوں شائیں کر رہی ہے۔ مگر سپیرے کی گرفت گردن پر سخت ہے۔ وہ مجھے انسانوں کے ہجوم میں لے آیا ہے۔ میرے آپس میں گھتے ہوئے دانتوں کا تماشا دکھا کر پیسے دو پیسے وصول کر رہا ہے۔ میں خود کو اسکی گرفت سے چھڑانے کی ایک زوردار کوشش کرتا ہوں۔ دم کی دلدوز لرزش ماحول پر حملہ آور ہو گئی۔ مگر میری گردن وہیں تھی۔ دانت آپس میں اسی طرح پھنسے تھے مجمع نے زبردست تالی بجائی۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے سے مجمع غائب ہو گیا۔ سپیرے کی پکڑ گردن پر اتنی سخت تھی کہ میں کراہنے لگا۔ چہرے پر اچانک پانی کے چھینٹے محسوس ہوئے۔ آنکھ کھلی۔ دیکھا ہیڈ میرے کان میں زور زور سے پھونک رہا تھا۔ ہیڈ کو اپنے سر پہ جھکا دیکھ گھگھیانے لگا۔

"گھبراؤ نہیں ...... ڈرو نہیں ...... یہ لو پہن لو ...... ہیڈ نے اپنا ہلمیٹ سر سے اتار کر میرے سر پر رکھ دیا۔

"Sir اگر یہ ہلمیٹ بھی ٹوٹ گیا تو؟"۔

"تو پھر دوسرا تیسرا ...... پھر ...... پھر ......"

"اسکے بعد؟"

"اسکے بعد یہی کہ تمہاری زندگی کی یہی سیکورٹی ہے۔ اس کے بغیر ہم سب نامکمل ہیں۔"

ہاں ......! اب اگر آپ میرے سر سے میرا ہلمیٹ اتار لیں تو اس کے نیچے آپکو میرا سر نہیں ملے گا کہ سر کا ہونا ہی عذاب تھا۔

اب راوی چین لکھتا ہے۔ ☆☆☆

چاہ نشین! فیڈ آوٹ ٹو بلیک

کنواں گہرا تھا——

اسکے میڈک سب کے سب عافیت میں تھے۔ پانی کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ میڈکوں کی پیٹھ کا رنگ اتنا گاڑھا ہو چکا تھا کہ پانی سے الگ انکی شناخت مشکل تھی۔ جب کبھی اوپر سے ڈول کے گرنے سے اتھل پتھل ہوتا اور میڈک اپنا توازن کھو کر چت پٹ ہونے لگتا تو معلوم ہوتا کہ اس گہرے کنویں میں جاندار موجود ہیں۔ اور جب چت ہوتے تو ان کے پیٹ کا زردی مائل سفید رنگ اندھیرے میں بھک بھک دکھائی پڑتا ایسے جیسے لائٹ اور شیڈ کا تماشا ہو رہا ہو۔ کنویں میں میڈکوں کے اس ہجوم اور انکے مسلسل بخیر و عافیت ہونے سے یہ اندازہ ہوتا کہ یہ کنواں کسی ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں پیاسے بود و باش نہیں کرتے اور زمانہ قدیم سے کسی ویران حویلی کی گونگی صدا ان میڈکوں کے اطمینان کا باعث تھی۔ بس ایک ڈول تھا جو برابر ان

کے سروں پر لٹکتا ہوتا اور اسکے اوپر گول آسمان کنوئیں کی گولائی جتنا جو کبھی مکمل نہیں دکھتا میڈکوں کو۔ پانی نکالنے والے اس ڈول کی پینیدی میں کہنگی کے باعث مہین مہین چھید ہو گئے تھے ان سے پانی کی طرح روشنی بھی بوند بوند ٹپکتی تھی۔

جب پہلا چھید ہوا تھا تو میڈک بہت گھبرائے تھے کہ یہ جو نہیں تھا وہ کیسے ہو گیا۔ خصوصاً وہ میڈک جو لمبی عمر کے تھے انکے لئے یہ اچنبھا تھا۔ پینیدی میں روشنی کی بوند!! ایک عمر بیت گئی ایسا کبھی دیکھا نہیں مگر اس چھید کا اتنا فائدہ ضرور تھا کہ جب کبھی ڈول پانی نکالنے کے لئے نیچے سرکنے لگتا، تو روشنی کی بوند میں لرزش پیدا ہوتی جس سے سارے میڈک چوکنا ہو جاتے۔ ڈول کس سمت کس سیدھ میں اور کہاں گرے گا اس کا اندازہ کر کے وہ سب محفوظ علاقے کی طرف تیر جاتے —

پیر ڈھابس کہلانے والے معمر میڈک روشنی کی اس بوند کے بارے میں مشکوک تھے۔ گو کہ یہ بوند اب تک فائدہ بن کر ٹپکی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ روشنی کی یہ بوند اس پر چھائیں کا حسن بگاڑ دیتی ہے جو ڈول سے بنتی ہے۔ اور کبھی کبھی لرزتی بوندیں شکار پکڑنے میں بھی رکاوٹ بنتی ہیں۔ اپنے سروں پر ڈول کا سایہ سارے میڈک تسلیم کر چکے تھے۔ تسلیم کرنے والوں میں معمر کم مگر درمیانی اور نئی عمر کے میڈک بڑے فراخ دل تھے۔ تسلیم شدہ حقیقت میں ایک چھید سے نسلوں کے درمیان قائم آہنگ کے بگڑ جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دن ایک اور سوراخ پھوٹا۔ ڈول سے بوندوں کا ٹپکنا ضرور بڑھا مگر وہ ہلچل یا سراسیمگی نہ پھیلی جو پہلے سوراخ کے وجود میں آنے سے پھیلی تھی۔ دھیرے دھیرے ڈول کی پینیدی میں چھلنی کی مانند چھید بن گئے۔ اور جب کبھی ڈول پانی لیکر اوپر آتا تو مینڈک برسات کی پھوار کا مزہ لیتے گویا تبدیل شدہ حقیقتوں کی سودمندی سے سمجھوتے کی داغ بیل پڑتی ہی چلی گئی۔ البتہ پیر ڈھابس مطمئن نہیں تھے کہ اکثر روشنی کی جھلملاہٹ میں شکاران کے منہہ سے چھوٹ جاتے اور کبھی کبھی کسی غلط نشانے پر حملہ کر بیٹھنے سے منہہ کی کھانی پڑتی۔ پیر ڈھابس کے ان خیالات سے مینڈکوں کا ایک گروہ متفق نہ تھا۔ لہٰذا خیال کی ایک لہر یہ بھی اٹھی کہ کہنہ سالی نے ڈھابسوں کے جبڑے ڈھیلے کر دیے ہیں اور شکاران میں آ کر بھی پلٹ جاتے ہیں۔

ایک دن......

کنویں کے ساکت پانی میں زبردست اچھال آیا۔ سارے مینڈک ایک ساتھ پانی پر اچھلے۔ کوئی ایک لفظ گونج اٹھا تھا کنویں میں۔ لفظ نہیں ایک نعرہٗ وحشت کی گونج تھی۔ ایسا بھی کچھ سنا نہیں گیا تھا۔ سب کے سب گونج کی ہیبت میں مبتلا کنویں کی دراڑوں اور کائیوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ جسامت میں جو کم تھے وہ دراڑوں، کائیوں اور کھودلوں میں روپوش ہو جاتے مگر پیر ڈھابس جسامتاً ایسے تھے کہ ان کا کہیں گھس کر روپوش ہونا محال تھا۔ ہاں لمبی عمر اور تجربے کی بنا پر ان کا دم اتنا سدھا تھا کہ پانی میں ڈبکی لگا کر دیر تک خطرے کے ٹل جانے کا انتظار کر سکتے تھے۔ مگر ایک وقت ایسا آتا کہ کنویں کی پیٹ میں پڑے جمہٹ سے پانی کا ایک ریلا اوپر کی طرف اٹھتا اور ڈبکی لگائے سارے پیر ڈھابس اس ریلے کے ساتھ پانی کی سطح پر آ جاتے۔ کیونکہ ریلے سے پیدا شدہ مدوجزر پر ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ انکی یہ بے بسی کبھی کبھی انکی ہلاکت کی وجہ بھی بن جاتی۔ کنویں کے یہ نفوس اپنی قدامت سنی کے طفیل بے حد زیرک اور پیش آگاہ ہو گئے تھے۔ مدوجزر کے خطرات بھانپ کر دفاعی صورتیں پیدا کر لینے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ مگر کبھی کبھی پانی کے کنویں کے پیٹ سے اٹھنے والا ریلا اتنا تونگر ہوتا کہ انکی ساری مہارتیں آنکھیں موند لیتیں۔ اور وہ خود کو انکے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے۔

اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ کنویں کا جمہٹ ایک دوسوت اور کھسکا اور اسکے کھسکتے ہی کنویں کے پیٹ میں بھونچال آ گیا۔ مدوجزر اٹھا۔ پانی کی تہوں میں روپوش سارے ڈھابس اس مدوجزر سے نبرد آزما تھے۔ مگر ہوا وہی جو ہونا تھا۔ پانی کے ہلکوروں میں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہوتے ہوئے سطح آب پر کئی بار ابھرتے اور پھر ڈوبتے پھر ابھرتے، پھر ڈوبتے اور اس ابھرنے ڈوبنے میں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے ٹکراتے بلکہ ان اشیاء سے بھی متصادم ہوئے جو سڑگل جانے سے قبل ایک مدت تکپانیوں میں تیرتی رہتی ہیں۔

پیر ڈھابس سب کے سب اوپر آ گئے۔ اس اتھل پتھل میں معمر ترین ڈھابس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پیر ڈھابس کا پیر لنگ میں بدلنا بڑا سانحہ تھا۔ اور سانحے کی تفسیر انکے خوابوں کی لغت میں محض بدبختی تھی۔ معمر ترین ڈھابس کی ایک ٹانگ کا ضائع ہونا کسی بڑی آفت کا پیش خیمہ تھا۔ پیر۔ نیم پیر۔ غیر پیر۔ سبھی پیر لنگ کی اس المناکی کے شریک کنویں کے ہالے سے دِکھنے والے ماہ صورت آسمان کی جانب منہ اٹھائے تحفظ طلب دعاؤں میں مصروف

تھے کہ آفات کی گھڑیوں میں انکے لئے یہی ایک چارہ تھا۔ یہ دھان کے کھیت میں پیدا ہونے والے برساتی مینڈک نہ تھے جو ٹرٹر کے نعروں سے آسمان اٹھالیتے اور موقع ملتے ہی ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں کود جاتے۔ اور خطرہ زیادہ ہوتو تیسرے میں۔ گو کہ انکے لئے کھلا آسمان اور پھیلی زمین ہوتی ہے اور خطروں سے بچنے کے لئے کہیں سے کہیں چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ مگر برسات کے خاتمے کے ساتھ ہی انکی ذات بے آب ہو کر مٹی میں مل جاتی ہے۔ ان چاہی سالانہ موت ہی انکا مقدر ہوتی ہے۔ مگر پیر ڈھابس نے سالہا سال کنویں کے اس چھوٹے سے ہالے میں خود کو پروان چڑھایا تھا۔ کنویں کے اندر اور اسکے آس پاس کی ویرانی انکی میراث تھی۔ اس میراث کی اپنی ایک تہذیب تھی۔ ایک نظام تھا جسے وہ برساتی مینڈکوں کی طرح موسم بدلتے ہی ترک نہیں کر سکتے تھے۔ آسمان ان کا چھوٹا ہی سہی گدلا ہی سہی پر ان کے ساتھ زندگی کرنے کا ہنر وہ اپنے آپ ہی سیکھ جاتے۔ انہیں کوئی باہر سے آکر نہیں سکھاتا۔ باہر سے آنیوالی شئے انکے لئے وہی ڈول اور ڈول کی رسی تھی جس نے انہیں کبھی گزند نہیں پہنچایا ۔ وہ کھڑکھڑ کرتے نیچے آتی اور پیاسوں کے لئے پانی لیکر اوپر لوٹ جاتی۔ ڈول اور اسکی رسی سے انہیں ایک اور دنیا کے ہونے کی بشارت ملتی۔ یہ آگاہی ان کا سرمایہ تھی۔

سب کے سب کسی سنگین حادثے کے منتظر تھے۔ معمر ترین ڈھابس کی ٹوٹی ٹانگ کا کوئی مداوا نہ تھا۔ سب نے مل کر کوشش کی کہ بزرگ ڈھابس کی ٹانگ معمول پر آجائے اور وہ ٹانگ ایک بار پھر پانی میں ہلکورے پیدا کرنے کے لائق ہو جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ ٹوٹی ٹانگ پانی پر برگ بے شجر کی طرح ڈولنے لگی۔ پیر لنگ ایک پاؤں سے تیرنے کی کوشش کرتا تو بار بار اپنی سمت کھوتا۔ اور جہاں پہنچنا ہوتا وہاں پہنچتے پہنچتے ادھ مرا ہو جاتا۔ اس کے ساتھی ڈھابس اکثر اسے اپنے جسموں سے ٹھیل ٹھیل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا کرتے۔ پیر لنگ کے لئے شکار کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ بھول چوک سے اگر کوئی کیڑا یا پھتنگا سامنے آجاتا تو اسے نوالہ بنالیتا۔ مگر بیشتر وہ بھوکا ہی رہنے لگا۔

شاید حادثے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ مینڈکوں نے دیکھا کہ ان کے اوپر کا آسمان مٹ رہا ہے۔ کنویں کے منہہ پر لوہے کے راڈ پاٹے جا رہے تھے۔ رسی اور ڈول کے آنے جانے کی جگہ البتہ چھوڑی جا رہی تھی۔ پھر یکبارگی نعرہ وحشت ابھرا۔

لائٹ آن...... Light on

اس نعرے کے ساتھ ہی سارا کنواں روشن ہو گیا۔ مینڈکوں نے ایسی روشنی کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایسی روشنی کہ اوپر کا آسمان ہی غائب ہو گیا۔ ڈول کا سایہ بہت گہرا ہو گیا اور اسکے سوراخوں سے چھن چھن کر آنے والی ساری روشنی پیر لنگ کو اپنے نرغے میں لئے ہوے تھی۔ پھر کئی وحشت انگیز نعرے......

رول کیمرہ............ Roll Camera

رولنگ........... Rolling

ایکشن........... Action

کھر کھر کرتی رسی ڈول کو لئے پانی پر اتر رہی تھی۔ لوہے کی سلاخوں کے اوپر چار پاؤں والی شئے نصب تھی۔ مضبوطی سے قدم جمائے وہ شئے نیچے اترتے ڈول کو تاک رہی تھی۔ سارے مینڈک تاکنے والی اس شئے کو تاک رہے تھے۔ ڈول اپنے اندھیروں سمیت پانی کی سطح پر تھپ سے گرنے ہی والا تھا۔ سارے مینڈک شاک سے بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگے۔ پیر لنگ ایک پاؤں مارتا مارتا وہیں کا وہیں چکر اتارہا۔ بچنے کی آخری کوشش کی۔ پانی کے اندر ڈبکی لگائی۔ مگر دونوں پاؤں کا زور نہ تھا۔ پانی میں گہرا نہ اتر پایا۔ ڈول ایک ہولناک چھپاکے کے ساتھ پانی پر گرا اور تہوں میں اترتا چلا گیا۔ پھر نعرہ وحشت۔

زوم اِن........... Zoom in

بگ کلوز اپ.......... Big close up

فیورا یجیڈ ون........... Favour aged on

زوم آوٹ سلولی........... Zoom out slowly

ڈول کی رسی دھیرے دھیرے اوپر کھچ رہی تھی۔ ڈول ہلکورے بناتا پانی کی تہہ سے ابھر کر سطح پر آگیا۔ معمر ترین ڈھابس پیر لنگ ڈول میں بھرے پانی پر چت اپلا رہا تھا۔ اسکا زردی مائل سفید پیٹ روشنی میں چم چم کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے رسی ڈول کو اوپر اٹھانے لگی۔ پیر لنگ کا ٹوٹا پاؤں ڈول سے باہر لٹکتا دکھائی پڑ رہا تھا۔ جوں جوں چھید سے پانی گرتا جاتا ٹوٹا ہوا بے جان پاؤں بالٹی کے اندر سرکتا جاتا۔ آہستہ آہستہ پیر لنگ کا وجود مینڈکوں کے دائرہ نظر سے محو ہو گیا

۔خطرآگاہ مینڈکوں نے ایک ساتھ جست لگائی اور پانی کی تہوں میں الوپ ہو گئے۔نعرہ وحشت پھر بپا ہوا۔

زوم اِن کوئکلی.......... Zoom in quickly

فالوفراگس.......... Follow Frogs

نتھنگ آن سرفیس.......... Nothing on surface

زوم آؤٹ.......... Zoom out

فوکس دی بکٹ.......... Focus the Bucket

زوم ان.......... Zoom in

بگ بگ کلوزاپ.......... Big Big close up

فیوردی ڈیڈ.......... Favour the dead

اینڈ.......... And

ناؤفیڈ اوٹ ٹوبلیک.......... Now Fade out to Black

کنویں میں گہرا اندھیرا تھا۔اور پانی ایکدم ٹھہرا ہوا۔

میزبان پانی

خط!

تمہیں لکھ رہا ہوں۔

ہاں! ہاں! تمہیں ہی لکھ رہا ہوں۔ اسلئے کہ تمہیں لکھ سکتا ہوں۔ کہہ سکتا ہوں۔ یقین نہیں آرہا ہے یا تم یقین کرنا نہیں چاہتی۔

نہ سہی، پر.........

تمہیں ہی لکھ رہا ہوں۔ بجا ہے تمہارا شک۔ لیکن پڑھنے سے پہلے ہی تم اپنا فیصلہ کیونکر کر سکتی ہو۔ پڑھو اسے کہ کیا لکھا ہے۔ کتنا لکھا ہے۔ کیا کہنا چاہا ہے۔ یہ بری بات ہے کہ بغیر پڑھے یا سنے یہ شک......... کہ اس دو کوڑی کے کاغذ پر کچھ بھی لکھا نہ ہوگا تمہارے لئے۔ بس سیاہیاں پتی ہونگی۔ خیر لایقینی کی ڈور اس سچ سے بندھی ہے کہ میں نے برس دو برس

میں تمہیں کچھ نہیں لکھا۔ بری بات تھی یہ۔ پر اب ضرورت پڑ گئی ہے لکھنے کی۔

دراصل میرا لکھا پڑھنا تمہارے روٹین میں شامل نہیں۔ کیونکہ کبھی لکھا ہی نہ تھا۔ اب ضرورت پڑ گئی ہے تو لکھ رہا ہوں۔ کیسی ضرورت ....؟ تمہارا یہ سوال بھی بے جا اور بے محل نہیں ہے۔ اس سوال کو اس پوائنٹ پر یہ حق ہے کہ وہ اٹھے اور طالب جواب ہو۔ تو ضرورت اس لئے کہ اب میں اور تم دونوں مختلف زبان و مکان میں ہیں۔ اس اختلافی دوری کا یہ تقاضا ہے کہ میں لکھوں۔ میں جہاں ہوں شاید تم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں، مگر کیا کروں کہ میں ہوں، وہیں۔

پر دیکھو نا کیا حاصل ہے ایک SPACE TIME کو لانگھ کر دوسرے میں کودنے سے۔ جیسے ناپ جوکھ، رفتار، پیمانے وہاں چھوٹے تھے۔ وہ بات بھی چھوٹ جاتی۔ تو میں اس خط کے ذریعہ تمہیں پہچاننا چاہتا ہوں۔ ضرورت یہی ہے۔

وہ بات .... ہاں! وہ بات اپنے آپ میں پوری ہے اگر کہا جائے تو ورنہ پوری چیز کوئی ہوتی ہی نہیں۔

اس بات میں تم اور میں دونوں شریک ہیں۔ وہ تالاب ...... جھیل سے بھی زیادہ وسیع اور سمندر سے بھی زیادہ گہرا۔ یاد کرو۔ ابھئے موٹر بوٹ والا اسی کے کنارے تو ملا تھا۔ عمر میں ہم لوگوں سے ذرا بیس[۲] یا اکیس[۲] ہوگا۔ قد وہی جو عموماً ہوا کرتا ہے۔ دو دانت ہونٹوں کے قابو سے باہر، آنکھیں ڈراونی اور ڈوبی ہوئیں۔ ملا جلا کر جو حلیہ بنا وہ سنجیدگی کی دعوت نہیں دیتا۔ مگر وہ بڑی سنجیدگی سے خدا کے بندوں کو موٹر بوٹ پر تالاب کی سیر کراتا۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔ شاید تم نہیں تھیں وہاں جب اس نے یہ بات کہی تھی کہ مختلف SPACE - TIME وہ خواب ہے جو معقول ارضی زندگی جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ مگر یہ معقول حیات ارضی ہے کیا؟ تم نے پھر یہ سوال اٹھایا تو کہہ دوں کہ اس پر لوکشن کا پردہ ہے غیب جو تو میں اپنی تمناؤں کی شناخت شاید اس پردے کے پری طرف پا سکیں مگر جو MASTERS ہوتے ہیں ہر شئے، ہر خیال، ہر کھنک کو لفظوں اور انگلیوں سے گھیر لیتے ہیں۔ بڑی مہین مہین باریک باتیں تھیں۔ اچھا ہوا اس وقت تم وہاں نہیں تھیں ورنہ تمہاری Logic کی Study انہیں اور Micro-scopic بنا دیتی۔

تو میں، تم، بڑھیا اور اسکی ڈارلنگ بیٹی پانچ پانچ روپئے فی گھنٹہ کے حساب سے موٹر بوٹ میں سوار ہوئے تھے۔ بوٹ نے پھپھکارتے ہوئے بڑی تیزی سے کنارہ چھوڑا تھا۔ لگا تھا چند لمحوں کے لئے اس کرہ سے Jump کر گئے تھے ہم۔ پھر بیچ تالاب میں بوٹ بغیر لنگر کے لنگر انداز ہوگئی۔ چو طرفی کشش کے احاطے میں داخل ہوگئی ہو جیسے۔ ہم سب اطمینان کی سرحدوں سے باہر آچکے تھے۔ مگر وہ مطمئن لگ رہا تھا۔ بظاہر بوٹ میں کوئی خرابی نہ تھی۔ پھر بھی اس نے بوٹ کا بڑا سا ٹول بکس کھولا۔ اس سے بہت ساری ضروری اور غیر ضروری چیزیں نکال نکال کر پھیلا دیں۔ اس کے بعد ایک اور صندوق کھولا۔ الم غلم کا ڈھیر تھا وہ صندوق۔ میلے کچیلے کپڑوں کے ٹکڑے۔ الجھے تاروں کا گچھا اور کیا کیا تھا، کہنا مشکل ہی تھا۔ ہماری بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کھوج کر کیا نکالے گا۔ بیچ تالاب سے ہماری آوازیں بھی کناروں تک نہیں جا سکتیں۔ اچانک وہ چیخ پڑا ''مل گیا۔'' تین تاروں والا چھوٹا سا ایک باجا۔ بولا یہ دو تارا نہیں سہ تارا ہے۔ بیچ کا تار ایک ہے اغل بغل کے تار صفر محض، زیرو۔ تم سب صفر تک پہنچ چکے ہو۔ میں نے صفر ایک کے بعد ایک اور صفر دریافت کیا ہے۔ اور اگر یہ صفر میں نے دریافت نہ کیا ہوتا تو پھر یہاں جس پانی پر تم ٹھہر گئے ہو۔ جم گئے ہو۔ اس سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ اور نیک سواریاں بھولے بھٹکے ہی آتی ہیں اس طرف۔ پانی کا وشال کٹورا، یہ تالاب، مہمانوں کو کبھی نہ وداع کرنے کا ارادہ کرنے لگتا ہے۔ اس روک کو توڑ نے کے لئے میں ترنگیں اٹھاتا ہوں اس سہ تارے کو چھیڑ کر۔ میزبان پانی ترنگوں کی طوفان خیزی سے پسپا ہوتا ہے اور پھر آئے ہوئے لوگوں کو تعطل سے نجات مل جاتی ہے ہم چاروں ہنسے۔ ''کیا بکواس ہے؟ ہم نے تمہیں سیر کے لئے کرایہ پر لیا ہے۔ بوٹ آگے بڑھاؤ۔ موٹر کیوں بند ہوگیا۔''

''وہ اس لئے کہ اب تم سہ تارے پر باؤل سنو گے۔ لالن فقیر کا نام ضرور سنا ہوگا تم لوگوں نے؟''

''باؤل اور اس پر! جانتے ہو بجانا؟''

''کیا تم دونوں میں سے کوئی ایک گورو دیو رونیدر ٹھاکر سے یہ سوال کر سکتا تھا؟ ہے تملوگوں میں اتنی جرات؟''

''تم تو باتیں اس طرح کر رہے ہو کہ سب کچھ جانتے ہو۔''

''میں اکیلے ہی نہیں، تم اور تم سب، سب کچھ جانتے ہو۔''

''تمہاری طرح۔''

''نہیں بالکل اپنی اپنی طرح۔''

''کیسے؟''

''یہ نہیں کر سکتے۔ وہ نہیں کر سکتے۔ جھٹک دو اس سوال کو، تم سب جس چیز کے ساتھ چاہو جڑ سکتے ہو، تم سب بنے ہو اس سہ تارے کو چھیڑنے کے لئے۔ نکالو اپنے اپنے لاشعور سے اپنی اپنی انگلیاں اور رکھ دو ان تاروں پر۔ بج اٹھے گا۔ خبر دار جو ایسے سوال کئے۔ تم میں کوئی ایک آگے بڑھے اور لے لے یہ سہ تارہ۔ سنائے باؤل۔ میرے پاس سننے کے لئے اچھے کان ہیں۔''

ہم دونوں اوب کی انتہاؤں میں داخل ہو گئے تھے۔ یاد ہے۔ اس نے خود سہ تارا بجانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے تمہیں اپنے میں کسنا شروع کر دیا تھا۔ اوب اور سہ تارے سے بے خبر ہو کر۔ بس آواز ہی آواز لمس اور لمس۔ لذت آمیز۔ اچانک ڈیک پر کسی کے لڑھکنے کی آواز آئی۔ پتہ نہیں تم نے آنکھیں کھولی بھی تھیں یا نہیں۔ مگر میرے سامنے منظر عجیب تھا۔ ابھئے دا کی انگلیاں خون آلود ہو رہی تھیں۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پتلیاں لہو رنگ۔ جبڑے کرختگی کے شکار۔ بڑھیا یہ سب دیکھ کر لڑھک گئی تھی۔ اسکی لاڈلی شاید اس لہولہان صورتحال سے نپٹنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ابھئے دا نے سہ تارا پانی میں پھینک دیا۔ اور بڑھ کر لاڈلی کا گٹا پکڑ لیا۔ اس نے مزاحمت کی۔ ابھئے دا غرائے۔ تم ہڑ بڑا کر جیسے جاگ پڑیں۔ ہوا تھا نا ایسا ہی؟ غراہٹ نے تمہیں مجھ سے باہر نکال دیا تھا۔ پھر تم نے مجھے عجیب نظروں سے تاکا۔ پھر کیا تھا۔ میں نے لپک کر ابھئے دا کی گردن تھام لی۔ میرے ایسا کرنے پر ابھئے دا میں زبردست ردعمل ہوا۔ وہ ایک زخمی چیتے کی طرح دھاڑے۔

''میں تمہارا خون پیونگا۔ یہ میری غذا ہے۔ مجھے زندہ خون چاہئے!'' اور قریب تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرتے میں نے بوٹ کا اسٹاٹر دبا دیا۔ بوٹ نے جو زلزلہ خیز ہچکولے لئے تو ابھئے دا چت گرے اور بہت دیر تک اٹھے نہیں۔ بڑھیا کو جو ٹھنڈی ہوا لگی تو ہوش آ گیا۔ اور وہ چیخی۔ انکی دھوتی، انکے ننگے بدن پر پھیلا دی۔ بوٹ کنارے لگا ہی چاہتی تھی کہ ابھئے دا دھوتی سنبھالتے ہوئے اٹھے۔ عورتیں ایک بار پھر سہم گئیں۔ وہ میرے قریب آئے اور بولے'' تم نے کبھی موٹر بوٹ چلائی تھی؟''

میں نے کہا'' کبھی نہیں''

''پھر بھی تم اسے کنارے تو لے آئے۔ تو ہم جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں اسکی پوری آزادی ہے۔''

ہاں! تمہیں لکھنا یہ چاہتا تھا کہ یعنی وہ ضروری بات جس کے لئے تمہیں لکھ رہا ہوں ۔ ریکارڈ پر لے رہا ہوں کہ ایک دن وہ بڑھیا اپنے پاڑے کے ہجوم کو لیکر پہنچی تھی۔ اس دن تم میرے ساتھ پھر نہیں تھیں۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ ابھئے دا نے مجھے اپنی گہرائیوں سے پکڑ لیا تھا۔ اکثر ہم گھنٹوں اس خاموش چکر میں جار کتے۔ میں بے تکان سہ تارے پر باؤل گاتا اور وہ کبوتر کے پر کو جلے ہوئے موبل آئل میں بھگوتے اور اپنی سپاٹ جانگھ پر کچھ لکھتے۔ کچھ مٹاتے۔ جیسے وہ جانگھ نہ ہو...... ان پڑھ بالغوں کی سلیٹ ہو۔

اف اوہ...... پھر بات سرک گئی...... پر کیا کروں...... تمہیں اتنا لکھنا چاہتا ہوں، اتنا کہ ہزاروں، لاکھوں پنے سیاہ کر دوں۔ ان پنوں کی بوریت سنبھال پاؤ گی...... بولو...... تو جب ہم لوگ اس خاموش چکر سے باہر آئے تو کنارے پر وہ جھجوم کھڑا تھا۔

''دونوں میں سے کون ہے وہ؟ سور کا بچہ؟''...... بڑھیا نے ابھئے دا کی طرف اشارہ کر دیا۔ پھر بھیڑ نے ابھئے دا کے چیتھڑے اڑا دیئے۔

''حرامزداہ، لچا، بدذات۔''

بھیڑ چھٹ گئی تو میں ابھئے دا کے لڑھکے ہوئے تن سے جدا سر کے پاس گیا۔ دونوں آنکھیں کھلی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

''کیوں؟ ٹھیک ہے ابھئے دا! کیسا لگ رہا ہے یہ سب کچھ؟''

ابھئے دا نے پتلیاں نچائیں۔ شاید جواب دینا چاہتے تھے مگر ہونٹ دونوں کچلے ہوئے تھے۔ زبان گودے سے نکل کر پاؤں کی ایڑی سے لٹک رہی تھی۔ میں نے زبان کو اسکرو ڈرائیور کی نوک میں پھنسایا اور دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ دیا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا ——

''کیوں ٹھیک ہے ابھئے دا۔ کیسا لگ رہا ہے یہ سب کچھ؟''

''ٹھیک ہی ہے۔ ان لوگوں نے وہ کیا جو چاہتے تھے۔''

''کیا جواز تھا ان کے پاس؟''

''جواز ڈھونڈ کر پریشان ہونا نادانی ہے۔ وہ اتنے پوشیدہ ہیں کہ ان کا بیان مشکل ہے۔''

بہر کیف میں نے ان کے جسم کے بقیہ ٹکڑے اکٹھے کئے اور موٹر بوٹ کے انجن کے پرزوں کی طرح انہیں جوڑا۔ اور ابھئے دا پھر بن گئے۔ سیلف دبا اور وہ اسٹارٹ ہو گئے۔ خون سے لت پت دھوتی اٹھائی۔ بدن پر رکھا۔ موٹر بوٹ چالو ہوگئی۔ اور پھر اسی شانت چکر میں آپھنسے ابھئے دا بولے۔

میں نے سہ تارا پانی میں پھینک دیا ہے۔ اب نہ تم اسے بچا پاؤ گے اور نہ یہاں سے بوٹ نکل سکیگی۔ اندر کی ترنگو نے بوٹ کو جکڑ لیا ہے۔ اگر بوٹ ہلکی ہو کر کچھ اوپر اٹھے تو انکی جکڑ سے نکل سکتی ہے۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''بہت معمولی سی بات ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پانی میں کود جاؤ۔''

ابھئے دا اپنے اس جملے کی ادائیگی میں کٹھور اور بھیانک تھے۔ میں نے پھر کہا۔

''مجھے تیرنا نہیں آتا۔''

''آنا اور نہیں آنا کی بحث بیکار ہے...... کود جاؤ''

اور میں......

قتل ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے جلایا گیا یا دفن کیا گیا۔ یا گدھوں نے میری بوٹیاں اتار لیں۔ یا میری ہڈیاں کسی چکی میں پس کر فوسفورس بن گئیں — یا — میں نہیں جانتا کہ میرا کیا ہوا۔ تم اگر بتا سکتی ہو تو بتانا۔ پر میں موجود ہوں کسی مختلف Space Time میں۔ اپنے ہونے کا ریکارڈ ریک میں سجا دیا ہے میں نے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔'' نہیں''...... تو سنو میرا یہ خط تمہارے پاس جس صدی میں بھی پہنچے جواب ضرور دینا۔

☆☆☆

سوان، سوائن

رات کتنی ہوگئی ہوگی۔! شاید آدھی! .... نہیں! ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ ابھی تو آنسو خشک نہیں ہوئے۔ تو یہ رات نہیں شام کا کوئی لمحہ ہے۔ ہاں! شاید، شام ہی ہو۔ تو پھر دن ابھی ابھی یا ذرا پہلے رخصت ہوا ہے۔ پر......! وہ آیا رخصت ہوا۔ ۱۲ گھنٹے بیت گئے۔ پھر میں کہاں تھی۔ اسی چھت پر جہاں ابھی کھڑی ہوں۔ مگر یہاں سے دن کب گزرا۔ سورج کی شعاعوں نے تو مجھے کہیں سے نہیں چھوا۔ کیا ان شعاعوں کے بغیر بھی دن ہوا کرتا ہے، مگر اس انہونی کی اطلاع مجھے کسی نے نہیں دی۔ اگر ایسا تھا تو کسی نہ کسی کا یہ فرض ضرور بنتا ہے کہ وہ مجھے بتلائے کہ اب بغیر سورج کے بھی دن ہوا کرتا ہے۔ ہوا ہوگا ایسا۔ خیر۔

ابھی تو شام ہی ہے۔ بے حد گہری اور سیاہ فام مگر اس سیاہ فام شام کے بدن پر وہ اجلے اجلے پروں والا سوان (SWAN) جب اپنا پروا کرتا تو لگتا جیسے سورج نے پر باندھ

لئے ہوں۔ اس نے پر پھڑ پھڑائے اور میں دودھیا اجالے سے ڈھل گئی۔ سارا آنگن ڈھل گیا۔

''سوان''

''ہوں''

اندھیری راتوں میں دودھیا اجالوں سے جب تم مجھے نہلاتے ہو تو میں کیسی لگتی ہوں؟''

''کوہ قاف کی پری دیکھی ہے''۔

''نہیں''

''تو پھر کیا دیکھا ہے''

''خواب''

''خواب میں کیا دیکھتی ہو؟''

''خوابوں کا شہزادہ یعنی۔۔''

''خوابوں میں پری کیوں نہیں دیکھتی؟''

''حریفوں کو خواب میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی''

''بڑی حاسد ہو۔''

''حسد نہیں چاہت ہے''

''تو کس شہزادے نے باریابی حاصل کی ہے، تمہارے خوابوں میں''

''وہی ایس، ڈبلو، اے، ان۔(Swan)

ایک نادیدہ وناشنیدہ منظر

سوان کے اجلے بال و پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے، ہوا تیز ہوگئی، پروں کے بکھرنے کا سلسلہ بھی تیز ہوگیا۔ اجالے بکھرنے لگے، ہر شئے قابو سے باہر ہوتی جارہی ہے۔

''یہ کیا ہورہا ہے، میرے خدایہ کیا ہورہا ہے، پروں کی سلامتی کی بھیک مانگتی ہوں، ان پروں کو یکجا کردے نفلیں پڑھنے کا وعدہ کرتی ہوں''، وہ سجدہ ریز تھی۔

امی کہہ رہی تھیں۔ ''سحر تو رات بھر عبادت کرتی رہی، دن، بھر چھت پر دھوپ میں

تپتی رہی۔ رات کتنی تیز آندھی آئی تھی، پھر بھی تو چھت سے نہیں اتری، دیکھ آئینہ جا کر۔ سر پر کتنی دھول جمی ہے۔ سفید دھول۔"

"دھول نہیں امی جان یہ تو دودھیا اجالا ہے۔ رات بے حد پیاری تھی۔ نرم نرم سفید پروں والی رات سارا وجود روشن ہوگیا تھا۔ مگر اچانک وہ آندھی آئی جسے تم نے بھی محسوس کیا ہوگا امی۔ سارے پر بکھر گئے اس کے، بدن کے لال گوشت دکھنے لگے۔ مانو کھولتے ہوئے پانی میں اسے ڈبو کر پر نوچ لئے ہوں۔ میں نفلیں پڑھ رہی تھی اسکے پروں کی سلامتی کے لئے۔"

"دودھ والا آیا ہے، دودھ لے لے اور کل ۵ سیر زیادہ دودھ لانے کو کہدے"

"پانچ سیر زیادہ کیوں امی؟"

"تمہارے ابو نے کچھ مہمانوں کو بلایا ہے۔ میٹھے ٹکڑے اور فیرنی بنیں گے۔ رومی کی ہیٹ ٹرک کی خوشی میں۔"

گھر میں مہمان آنے والے تھے۔ ۱۲ فٹ بائی ۱۰ فٹ کے کمرے میں ایک مریل سا ٹرانسسٹر "درد آئے گا دبے پاؤں" والی نظم گنگنا رہا تھا کہ، ببو نے کنیگ کی چکری گھما دی اور پھر ویوید بھارتی سے ایک آواز ابھری......"یاہو"......چاہے کوئی مجھے جنگلی کہیے......!

گانا ابھی اسی مکھڑے پر تھا کہ کمرے میں وہ داخل ہوا۔ سفید ہیٹ، سفید گلو بند، سفید قمیض سفید پتلون۔ سفید کوٹ۔ سفید موزہ۔ سفید جوتا۔ سراپا سفید۔ اور میں اسے پردے کی اوٹ سے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک ہوا کا ایک ریلا آیا اور پردے کو اوپر اٹھا لے گیا۔ پوری کی پوری میں اور سارا کا سارا وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے تھے۔ اس کے سیمیں عکس نے جیسے چاندی کا لباس عطا کر دیا ہو۔

چند ساعتوں کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے، وہ بولا۔

سوان ہیر......SWAN HERE!

"جی!" جواب میں بس یہی ایک لفظ۔

"خالہ اماں سے آداب کہیئے۔ انکل نہیں دکھتے؟"

"جی! وہ" اور اب دو لفظ۔

"میرے پاپا بھی آرہے ہیں آج"

"جی، آئی بتا کر" ایک لفظ اور بڑھا۔

ٹرانسسٹر والا گانا بڑھتے بڑھتے پہنچ چکا تھا اس لائن پر ......

"ہم پیار کے طوفانوں میں گھرے ہیں ہم کیا کریں"

ابھی یہ گانا اپنے آخری مرحلے ہی میں تھا کہ اس کے پاپا اور دوسرے مہمان بھی آگئے۔ میرے ابو انکی خاطر تواضع میں پیش پیش تھے۔ مگر چھوٹا سا کمرہ اور دو بیٹری والا مریل ٹرانسسٹر خلوص کی ساری حرارت کو درجہ حرارت کے سب سے نچلی پائیدان پر پہنچائے دے رہے تھے۔ اس کے پاپا نے برف پر سرد مہری کی ایک اور تہہ جماتے ہوئے کہا۔

"میاں سیفی! اپنے فٹ بالر دوست کو گھر پر ہی بلا کر ضیافت کر دیتے۔ اس کے ہیٹ ٹرک کی خوشی دوبالا ہو جاتی۔ کلب کے پریسیڈنٹ کو بھی بلا لیتا۔ یہاں دو آدمی اور آجائیں تو نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ میری حاضری ہوگئی تمہیں رکنا ہو تو رکو۔"

ابو نے انہیں روکا "دراصل انتظام چھت پر ہی کرتا مگر سردی کا موسم ہے نا، شبنم کے ڈر سے......"

"بھئی میں شبنم سے ڈرنے والوں سے خود بہت ڈرتا ہوں۔ پھر کبھی۔ خدا حافظ۔"

اس کے پاپا چلے گئے۔ بھائی جان کی ہیٹ ٹرک میدان واپس ہوگئی۔ مگر SWAN نہ گیا۔ بھائی جان کی دل جوئی کرنے میں لگا رہا۔ اور ایسے میں ہمارے درمیان کی کئی اور دیواریں گر گئیں۔

"آپ خود کو SWAN کیوں کہتے ہیں؟"

"کہنا آتا ہے اسلئے کہتے ہیں۔"

"بات سے بات بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے"

"سیکھنا تو میں تم سے بھی چاہتا ہوں۔"

"کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپکو اردو میں کوئی عرفیت نہیں ملی تھی۔"

"وہ بھی ہے۔ مگر یہ نام صرف تمہارے لئے ہے۔ اور میں اپنا یہ نام تمہارے نام کرتا ہوں۔ ابھی، اسی وقت، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

(طویل قربت، لمبی خاموشی)

"آپکے ملبوس سب ہی سفید ہیں۔ داغ دھبوں سے ڈر نہیں لگتا آپکو۔"

"ڈر، خوف یہ دونوں لفظ خود ہی داغ دھبے ہیں، جہاں یہ نہیں وہاں داغ دھبے بھی نہیں۔"

"آخر کیوں پسند ہے آپکو یہ رنگ؟"

"وہ اسلئے کہ یہ سات رنگوں کا سنگم ہے۔"

"گویا آپ ست رنگے ہیں۔"

"نہیں یک رنگے، سفید سوان۔"

"آپ ملنے بھائی جان سے آتے ہیں مگر سارا وقت یہاں چھت پر......؟"

"تمہیں اعتراض ہے؟"

"بالکل نہیں، میں تو نصیبوں والی ہوں، اور خوش قسمت ٹھہرتی اگر آپ ملنے بھی مجھ سے آتے۔"

"ہر اچھی چیز کی تحصیل کسی وسیلے، کسی بہانے سے ہوتی ہے۔"

"مگر میں پر خلوص چاہت میں بہانے کی قائل نہیں...... محبت، دلفریبیوں سے عبارت نہیں محبت اپنے وجود کو دوسرے وجود میں تلاش کرنے کی سعی ہے۔ اس میں کامیابی احساس وحدت جیسی لازوال مسرت سے ہمکنار کرتی ہے۔ میں اسی لافانی لمحے کی منتظر ہوں۔ میں نے خود کو تم میں پایا ہے۔ مگر کیا تم......؟"

میری ان باتوں سے سوان کے سفید سفید پر کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ میرے دل میں ہول سا اٹھنے لگا۔ میں اسکے چہرے پر ہلکی سی بھی پریشانی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں ایسی باتیں مجھ سے ہو گئیں۔ اور اس کے چہرے کی ملالی کیفیت بھی برداشت کر گئی۔ شاید اسی لئے کہ پرکھوں کا بھرم نہ کھلے، خاندانی عزت وناموس کو بٹہ نہ لگے۔ شاید سوئی کی یہی وہ نوک تھی جو چاہت کے بھرے کٹورے میں کھب گئی تھی۔ اس کے ایک جملے نے مجھے بانٹ کر آدھا کر دیا تھا۔ میرا نصف اس کے ساتھ ہی نکل بھاگا تھا اور میں نصف جئے جا رہی تھی۔ اور ایک دن نصف مر رہی تھی کہ اس کا خط حیات کی ایک بوند بن کر

جس سیڑھی سے بھی چڑھ کر جاتا تھا، تمہارے لئے جاتا تھا۔ ڈیڈی کی حقارتیں سہتا رہا تمہارے لئے۔ اور اب تو وہ وار بھی سہ لونگا جو تار ہستی کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ سب کچھ منظور کہ میں ہوں صرف تمہارے لئے۔

تمہارا

ایس ڈبلو اے ان

خدارا ایسا نہ کہو! تم ہزار ہا سال سلامت رہو۔ مجھ جیسی ہزاروں کنیزیں تم پر قربان، میرے سوان۔ تم پر کوئی وار نہ ہو۔ خنجروں کے لئے میرا کلیجہ سلامت۔ تمہیں کیا معلوم کتنی نفلیں پڑھی ہوں گی۔ کاش کہ ہونٹوں سے ادا ہوئے الفاظ کو تم میرے دل کی بات نہ سمجھتے۔ خاندانی شرافت کی پاسداری نے مجھے اداکار بنا دیا ہے۔ میں اداکاری کر رہی ہوں اور میری بدنصیبی یہ ہے کہ تم نقل کو اصل سمجھتے ہو۔

''ارے بو تو تو کانونیٹ میں پڑھتی ہے، یہ سوان کا مطلب کیا ہوتا ہے۔''

''کیا کہا پھوپھی آپ نے سوائن؟''

''ہاں ہاں، کیا مطلب ہوا اس کا؟''

''سوائن کا مطلب 'سور' ہوتا ہے پھوپھی۔''

''کمبخت ٹھہر تو سہی۔ میری لاعلمی کا مذاق اڑاتی ہے۔ آج ہی تیرے ابو سے کہکر تیری مرمت کرواتی ہوں۔''

کیا اناپ شناپ مطلب بتا گئی سوان۔ کیا مطلب ہوتا ہے تمہارا، کبھی تو سمجھایا ہوتا اپنا مطلب۔ کیا تمہارا مطلب یہی ہے جو بو نے بتایا۔ خدا نہ کرے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔

میرے جوابی خط کے سخت لب و لہجے نے اسے جیسے ہلکان کر دیا...... ایک دن وہ پھر بڑے بھیا کے بہانے گھر آیا۔ آنکھیں ویران، چہرہ مضمحل، اپنے سوان کو اس حالت میں دیکھ کر میں بلبلا اٹھی۔ کاش کہ دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی۔ اسکے سارے درد سمیٹ لیتی۔ مگر اس کے بہانے ہمارے درمیان حائل تھے۔ میں چھت پر چلی گئی۔ اس کے سامنے خود کو بے قابو

محسوس کر رہی تھی ۔ اپنے خط کے سخت گیر لہجے کے لئے ندامت کے آنسو بہا رہی تھی کہ آواز ابھری۔

''سحر''

اور جیسے صبح ہوگئی۔ سوان تھا۔ مگر اپنی اداکاری جاری رہی۔

''آپ، آپ یہاں کیوں، آپ کو شاید میرا خط نہیں ملا۔ آپ نے کھلے لفظوں میں مجھے خط لکھ کر رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''دیکھو سحر! میں تمہاری خاطر تمام دیواریں توڑ دونگا۔ یہ زرداری اور ناداری کے قصے مٹا دوں گا۔ ضرورت پڑی تو زندگی کی دیوار بھی۔''

''نہیں۔ رک جایئے۔ ایسی بات زبان پر نہ لایئے۔'' میں نے سوان کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔ شام دھیرے دھیرے سلگنے لگی۔ شام کا سفر شب کی جانب اور شب کا سفر صبح کی جانب سبک خرامی کے ساتھ۔ شکوے، گلے، بیچارگی، جبر، حقارتیں سب ٹوٹ کر سوان کی باہوں میں گھلنے لگے۔ میرا وجود بھی اسکے پنکھوں میں کچھ اس طرح پگھلنے لگا کہ اچانک مجھے سوان کے مطلب کا خیال آیا۔

''آپ خود کو سوان کہتے ہیں ۔ کیا مطلب ہوتا ہے اس کا۔ بو نے بڑا خراب مطلب بتایا ہے اس کا۔''

''کیا مطلب بتایا ہے اس نے۔''

''سوان کا مطلب سور۔''

''بہت شریر ہے بو۔'' وہ ہنسا۔

''وہ کہتی ہے کہ اسکی مس کشور بھٹ کے یہاں سوان کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے البتہ جب وہ کلوٹے ماتھر کو بلاتی ہے تو بولتی ہے ''یو سوائن'' اس کا مطلب تو سور ہی ہوتا ہے نا۔''

''سحر تم بڑی بھولی ہو۔ دراصل دونوں کے ہجے الگ ہیں۔ اس سوائن کا ہجے ہے اس، ڈبلو، آئی، این، ای (SWINE) اس کا مطلب سور اور میں یعنی سوان، اس۔ ڈبلو۔ اے ۔ ان (SWAN) اس کا مطلب؟''

''ہنس''

اور پھر سوان کے پر پھیلنے لگے اور میں پھر ان نرم نرم سفید گدیلے پروں کی ڈھیر میں دھنستی چلی گئی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر احساس وحدت کی شدت کی انتہاؤں پر تھی کہ اچانک معلوم ہوا کہ پروں کے ڈھیر سے ہنس کب کا سرک چکا ہے۔ وہ پر نہیں تھے، کیچلیاں تھیں جنہیں چھوڑ کر اس کا سانپ کسی نئے پڑاؤ کے لئے جا چکا ہے۔

میرے گھر کا کمزور بیٹریوں والا ٹرانسسٹر اور بھی کمزور ہو گیا۔ ''درد آئے گا دبے پاؤں'' والی نظم میرے اندر چکر کاٹ رہی ہے۔ سوان تم دیواروں کے قیدی ہو گئے۔ تمہیں بے دیوار کھلی چھت تو بہت پسند تھی مگر میرے ہنس تم نے اپنا جوڑا ایئر کنڈیشن کمرے کی بند دیواروں میں ہی تلاش کیا۔ کہو ہنس کیسے ہو۔ میرے درد کی آہٹ ملتی ہے تمہیں کیسے ملے گی ہنس!

سنا ہے تمہارا جوڑا انڈوں پر بیٹھا ہے اور تم رنگین ٹی وی پر کوہ قاف کی پریوں کے رقص میں کھوئے ہو۔ میرے مریل ٹرانسسٹر کی بیٹری ختم ہو رہی ہے میرے سوان...... اب وہ خاموش ہو جائیگا سوان، میرے سوان میرے ہنس، وداع، وداع

بوا اپنا سبق دہرا رہی تھی۔

ایس فار سوان، سوان معنی ہنس۔

ایس فار اسنیک۔ اسنیک معنی سانپ

اس فار سوائن۔ سوائن معنی............

سور!

سور!

سور!

☆☆☆

میرے نام کی ایک روٹی

(مرحوم وکیل اختر کے لئے جو میرا پہلا Boss تھا، نہ تھا)

اور جب میں داخل ہوا۔

اپنی روٹی کے کارخانے میں۔ مجھے نظر آیا وہی پنجر۔ ہڈیوں کا۔ فاسفورس سے لت پت۔ سلگتا ہوا۔ روشن روشن مگر بے الاؤ۔ شاید بیچ کے نیستی شکن دنوں نے تھوڑی کوشش کی تھی۔ اور ہڈیوں پر دھیرے دھیرے ایک تہہ گوشت کی اجاگر ہو چلی تھی۔ اس سے وہ سخت پریشان تھا۔ وقت نے اسے جتنا کھول کر رکھ دیا تھا اس تناسب سے وہ وقت کو نہ کھول سکا تھا۔ شاید اسی لئے اس فطری شکست کو وہ برسوں پہلے قبول کر چکا تھا۔ زندگی کی اس سیڑھی پر کسی طرح کا جوڑ گھٹاؤ اس کے سینے میں کھٹی ڈکار اور پیٹ میں تیزاب بھر دیا کرتا تھا۔ اس کے بدن پر گوشت کا وہ بیج اور اس میں دبی ہوئی اندھی کوکھ لہو کا وہ قطرہ اپنے اندر سموئے ہوئی تھی جو بیک وقت آدمی کو اس دھرتی پر عظیم مخلوق اور دُکھ پسند خالق بنا دیتا

ہے۔اور یہ خالق سدا اپنے دکھوں کو ہمارے دائرہ نظر کی گرفت سے دور رکھتا ہے۔

روح تخلق قید جسم سے ابل کر ذرا کسمسائی۔ اس نے کوٹ کے بٹن کھولے۔ کلیجے پر لمبی پھونک ماری۔ گھنٹی بجائی۔ ایک گونج۔

Come in !

وعلیکم السلام!

تشریف رکھیے!

تو اس پنجر پر اگے ہوئے گوشت کو چھپانے کا اہتمام مہتمم نے اکائیوں کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ یعنی کمر سے اوپر ٹیری کوٹ کی آوارہ قمیض اور ناف سے نیچے ایڑی تک لٹکتی ہوئی ایماندار پتلون۔

میری روٹی کے کارخانے کا یہ فورمین تھا میرا باس۔ ”سینڈوچ کھایا ہے کبھی آپ نے؟“

میرا یہ باس سینڈوچ ہی تھا۔ شور تخلیق اور رگ محکومیت کے درمیان دبا ہوا۔

Subordinate چکھا ہے آپ نے؟

یہ نوالہ ہوتا ہے کبھی مکھن روٹی کا۔ کبھی چھری کانٹے کا۔ میرا باس دونوں طرح کے نوالوں کا عادی ہو چکا تھا۔ ان میں تفریق کرنا خدا کے برگزیدہ بندوں میں تفریق کرنا سمجھتا تھا۔ میں اپنی روٹی کے کارخانے سے الگ کر دیا گیا۔ میرا باس چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کارخانے میں نہ ٹکا سکا کہ روٹی ضابطوں کی اندھی سرنگ سے گزر کر میرے پاس آتی تھی۔ میرا باس اتنا کرتا کہ روٹی پر میرے نام کی مہر ثبت کر دیتا اور بس۔

ایک دن میرے باس نے کہا۔ ”تم نے مجھ سے کبھی روٹی خود نہیں مانگی۔ تمہاری روٹی جیسے میری ہی روٹی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں اعتراض نہ ہوگا، لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں کہ تمہاری روٹی پر اپنے نام کی مہر لگا دوں۔“

میرا باس کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ کہاں جانا چاہتا تھا۔ نہیں معلوم۔ میں اسے قطعی طور پر پہچان نہ سکا کہ آج میری روٹی اپنی پیٹھ پر چوراچکوں تک کا نام سجائے مجھ سے دور کھڑی اپنی ران کھجا رہی ہے۔

اور پھر۔

جتنے دنوں کو میں انگلیوں پر گن سکتا تھا، اتنے ہی دنوں بعد میرا باس —— مر گیا!

اسکی موت کے بعد Lab Report سے یہ معلوم ہوا کہ پیٹ کے چھری کانٹے (جو زیادہ مقدار میں پائے گئے) پیٹ سے نکل کر شریانوں میں داخل ہو گئے اور خون کے بہاؤ نے انہیں اس کے دل تک پہنچا دیا تھا۔

انا للہ وانا علیہ راجعون!

نیل کنٹھ کا اصل

ڈاکٹر نیل کنٹھ کے بارے میں وہ تذبذب کا شکار تھا۔ آج کی پارٹی میں ڈاکٹر نیل کنٹھ ایسا نہیں تھا، جیسا کہ وہ ہے۔

شرما نے پارٹی میں آدھا گھنٹہ دیر سے آنے کی معذرت چاہی۔ مگر وہ حیران رہ گیا۔ جب شرما نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر نیل کنٹھ کو وہ ابھی ابھی دفتر میں چھوڑ کر آیا ہے۔ کمپوٹر گرافکس پر ایک اہم میٹنگ چل رہی ہے۔ ایک جدید ترین کمپوٹر مشین منگائی گئی ہے۔ کل ہونے والے SATELLITE,96 کے تماشے کا دارومدار اسی نئی مشین کے جادوئی EFFECT پر ہے۔ A WONDER, A MAGIC REALITY INSAT-210 کے لانچ کے بعد Communication Revolution پر بڑی پیچیدہ بحث چل رہی تھی۔ شرما کو پارٹی میں آنے کی جلدی تھی۔ لہٰذا نیل کنٹھ سے اجازت لیکر میٹنگ سے باہر نکل آیا اور پارٹی میں

پہنچ گیا۔ پہنچا تو دیکھا، نیل کنٹھ پارٹی میں پہلے سے ہی موجود ہے۔ شرما نے اسے نیل کنٹھ کے بارے میں یہ کہکر تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر وہ پارٹی میں ڈاکٹر نیل کنٹھ کی آمد سے لے کر مس بجاج کو خطرناک حد تک SEDUCE کرنے کی سعی مسلسل تک (جواب بھی جاری ہے) کے تانے بانے کو جوڑ جوڑ کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ صحیح ہے کہ اسے بار میں داخل ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ بار میں داخل ہونے کے ۲ دروازے ہیں۔ جہاں اس نے دو ایسے دوستوں کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے جو کم وبیش اس کے تمام ملاقاتیوں اور عزیزوں سے واقف ہیں۔ ان سے پوچھنے پر بھی اسے یہ معلوم ہوا کہ نیل کنٹھ کو ان لوگوں نے دروازے پر Receive نہیں کیا ہے۔ یہ اطلاع بھی اس کے لئے باعث استعجاب تھی۔ پھر اسے تیسرے دروازے کا خیال آیا۔ جو کلب کے سکریٹری کے روم سے ملحق ہے۔ مگر وہ عام مہمانوں کے آنے جانے کے لئے نہیں ہے۔ اراکین کے لئے ہے۔ اور جب کبھی ایسی پارٹی ہوتی ہے تو اس میں تالا لگا دیا جاتا ہے۔ آج بھی تالا بند تھا۔ پارٹی میں آئے اور بھی کئی لوگ جو نیل کنٹھ کے واقف کار ہیں اسکی Entry کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہ بتا سکے۔ دراصل ایسی پارٹیوں میں Entry, Exit کی کس کو پرواہوتی ہے۔ پرواہ تو صرف اسکی کہ نیل کنٹھ فریفتگی کے عالم میں مس بجاج سے کیا کہہ گیا ہے یا کہنے والا ہے۔ ان واقف کاروں کی ناواقفیت پر وہ جھلا گیا۔ پھر شرما کا بیان؟ وہ اس کے بیان کے بارے میں مشکوک ہو گیا۔ ممکن ہے شرما سے کوئی چوک ہو رہی ہو۔ شرما، نیل کنٹھ کا ادنیٰ سا Subordinate ہے۔ اس نے نیل کنٹھ کو مدعو کرتے وقت شرما سے بھی گذارش کی تھی آنے کی کہ شرما Subordinate تو تھا مگر P.R یعنی تعلقات عامہ کا۔ Super-Master بھی تھا۔ اسے پکڑ لینے کا مطلب ہوتا ہے، دفتر کی شہہ رگ کا ہاتھ میں آجانا، ڈاکٹر نیل کنٹھ کو دعوت تو محض Formality تھی۔ شرما کی دعوت بہر حال Reality تھی۔ اس کے بیان پر شک کرنا اس پر بھاری نہ پڑ جائے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اسکے بارے میں کچھ نہ سوچے۔ اس پارٹی میں جو کچھ جیسا ہے ویسا ہی رہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔ مگر وہ ایک ایسے پیشے سے متعلق ہے جہاں Probe، تجسس، تلاش، ہر لفظ، ہر جملے، ہر حرکت پر سوالیہ نشان قائم کرنا معمول سا ہے۔ وہ شرما کے بیان اور نیل کنٹھ کی آمد کے عقدے کو سلجھانے میں الجھا ہوا تھا کہ اسے سرانا کی آواز سنائی پڑی۔ جو نیل کنٹھ

سے مخاطب تھا۔ .... ''ڈاکٹر نیل کنٹھ آپ یہاں کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو ابھی ابھی اپنے گھر میں اپنی بچی کی سالگرہ کا کیک کاٹ رہے تھے۔ یہیں سے فون پر مبارکباد دی آپکو۔ آپ نے خود ہی شکریہ کے ساتھ میری مبارکباد وصول کی ہے۔''

.... نیل کنٹھ جیسے سنی ان سنی کر رہا تھا۔ ایک ذرا سرانا کی طرف تاکا اور پھر مس بجاج کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر خاموش گفتگو میں مشغول ہوگیا۔ اب تو اسے شرما کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔ شرما، سرانا دونوں کو ہی اصرار تھا کہ نیل کنٹھ کو اس پارٹی میں نہیں ہونا ہے۔ نیل کنٹھ کو وہاں ہونا ہے جہاں وہ ابھی ابھی ہے۔

اس نے پھر کرید شروع کی۔ ایک بوڑھے اور تجربہ کار بیرے نے بتایا کہ وہ پارٹی میں ہر آنے والے پر گہری نظر رکھ رہا ہے۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ دونوں دروازے میں سے کسی بھی ایک دروازے سے نیل کنٹھ کو داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ جن میڈم کے ساتھ وہ بڑی دیر سے چپکے راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں، انکو دروازے سے داخل ہوتے ہوئے ضرور دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ میں لائف سائز پورٹریٹ یا کوئی فریم ضرور تھا جو انہوں نے کاغذ میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اسے لیکر تیز تیز قدموں سے Gift Counter کی طرف چلی گیئں۔ پھر جب واپس ہوئیں تو پہلی بار انکے ساتھ نیل کنٹھ صاحب کو دیکھا۔ شرما، سرانا، اور وہ تینوں اس بوالعجبی پر حیران تھے۔ مگر وہ اس Gay Moments میں پوچھ تاچھ کر کے Scene Create نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اچھی خاصی پارٹی، سراغ رسانی کے چکر میں خراب ہو جائیگی۔ ویسے بھی وہ اسکی لیاقت و ذہانت کا پرستار تھا۔ Computer Lok کا شاید وہ پہلا Div.Manager تھا جس نے گھاٹے میں چلنے والی اس فرم کو منافع دیا تھا۔ اسکی مقناطیسیت اور پروقار شخصیت نے دفتر اور پروڈکشن سینٹر کے کارندوں کی سوچ کی دھارا بدل دی تھی۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت تھی کہ نیل کنٹھ دفتر میں ۲۲ گھنٹے بے تکان مصروف رہنے کے باوجود تعلقات عامہ فیملی لائف، گرل فرینڈز کے درمیان ناقابل یقین توازن کس طرح برقرار رکھتا ہے۔

نیل کنٹھ سے اسکی پہلی ملاقات سائنس سیٹی میں ہوئی تھی۔ وہ نمائش کے لئے بسنے والے ''ڈائنا سور ولیج'' کی تیاری کمیٹی کے مشیروں میں تھا۔ بلکہ اسے Cheif

consultant کا درجہ حاصل تھا۔ ڈائنا سور کی دم میں حرکت نہیں ہے۔ سر، گردن، پاؤں، سارا جسم برقی توانائی سے لبریز طوفان اٹھاتا ہوا مگر دم ساکت۔ بے حس و حرکت۔ کوششیں بہت ہوئیں کہ دم کو حرکت دی جائے۔ مگر سب بیکار۔ دم نہ ہلنے پر اڑی رہی۔ منتظمین کو لگا جیسے سارے لمحے آکر اس دم پر ٹھہر گئے ہیں۔ بالکل Static۔ جامد۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ کل صبح دس بجے نمائش شروع ہونے کو تھی۔ اسکو Dismantle یا ادھیڑ کر دوبارہ بنانا مشکل تھا۔ سارا بخار اس پر اترنے والا تھا کہ اسی کی کمپنی نے سارا میٹریل سپلائی کیا تھا اور Know-How بھی۔ آخر کار نیل کنٹھ کو بلایا گیا۔ وہ آیا۔ سب سے پہلے اس نے پاؤں کے ناخن یعنی کھر دیکھے۔ پھر آنکھیں دیکھیں۔ پیٹ اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرے۔ دم سہلاتے سہلاتے نہ جانے کون سی رگ چھیڑی کہ ڈائنا سور پاگل گھوڑے کی طرح ہنہنایا اور ایک لمبی جست لگائی۔ بس اسی دن سے وہ نیل کنٹھ کا پرستار ہو گیا تھا۔ اور نیلکنٹھ نہ ہوتا تو دوسروں کی نا اہلی کا جرمانہ اسے بھرنا پڑتا۔

لیکن آج کے واقعہ نے اسے نیلکنٹھ کے بارے میں مشکوک کر دیا تھا۔ کل دفتر جا کر ہی صاف صاف پوچھ لیگا وہ۔ دوسری صبح وہ نیلکنٹھ کے دفتر میں تھا۔ نیلکنٹھ کے چمبر میں پہلے سے ہی کئی Visitors جا چکے تھے۔ ان کے نکلنے کے بعد ہی اسکی باری آئی۔ نیلکنٹھ اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ اور رات کی کامیاب پارٹی پر مبارکباد دی۔ .... مگر آپ میری پارٹی میں گئے کیسے؟ آپ کے شرما جی نے بتایا کہ وہ آپکو دفتر میں ایک میٹنگ کے درمیان چھوڑ کر آیا ہے۔ آپ جب میٹنگ میں تھے تو میری پارٹی میں کیسے تھے؟ (نیل کنٹھ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی) ٹھیک اسی وقت سرانا نے بتایا کہ آپ اپنے گھر پر اپنی بچی کی سالگرہ کا کیک کاٹ رہے تھے۔ آخر ایک آدمی بیک وقت تین جگہ کیسے ہو سکتا ہے؟

نیل کنٹھ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنا ریڈنگ گلاس اتارا۔ صاف کیا اور بولا۔

"تمہارے سوالات بھی صحیح ہیں اور میرا تینوں جگہ بیک وقت ہونا بھی درست ہے۔"

نیل کنٹھ کا یہ جواب سنکر اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نیل کنٹھ اسکی

حیرت پر مسکرایا۔

''یار، Don't be Crazy ایسا ہونا بہت سرل Simple ہے۔''

''تو کیا کرشمہ، معجزہ، انہونی یہ سب سرل ہے۔ سب کچھ اتنا آسان ہے۔ کوئی پیچیدگی نہیں۔''

''ہاں! جب مجھے بیک وقت کئی جگہ ہونا ہوتا ہے تو میں وہاں وہاں ہوتا ہوں۔ بس کرنا یہ ہوتا ہے کہ صبح صبح Appointment Diary دیکھتا ہوں پھر ضرورت کے مطابق اپنی سکریٹری سے کہکر اپنا Xerox (زیراکس) کروالیتا ہوں۔'' یہ سن کر وہ چکرا گیا جیسے۔

آدمی کا بھی زیراکس!! ''ہاں یار! وہ بھی میں ہی ہوتا ہوں، بالکل میں، مگر تمہیں یہ نہیں بتا پاؤنگا کہ اس وقت میرا اصل کہاں ہوتا ہے!!''

نیل کنٹھ مسکرا رہا تھا اور وہ اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں اس کا اصل بھی غائب تو نہیں ہوگیا......!!

☆☆☆

موَن

(ظفر اگانوی کے نام)

ہوا کچھ بھی نہ تھا۔ حالات اطمینان بخش تھے۔ رات بھی پرسکون تھی۔ اور صبح میں ڈھلا ہی چاہتی تھی۔ بس اچانک ...... ہاں! اچانک ہی وہ نیند سے بیدار ہوا اور نرخرے سے ہوائی حملے کے وقت بجنے والے سائرن جیسی خطرناک آواز نکالنی شروع کی۔ آواز میں گونج اتنی تھی کہ سارا محلہ لرز اٹھا۔ گھر کے سب ہی سوئے پڑے مرد وزن بستروں سے چھلانگ لگا کر زمین پر آ گئے۔ پھر اسکی خوابگاہ کی جانب دوڑے۔ آواز اسکی خوابگاہ سے ہی آرہی تھی۔ گھر کے لوگ حیران تھے سائرن تو روز دن کے نو بجے تھانے کی عمارت سے بجایا جاتا ہے۔ وہ بھی نرم آواز میں مشق کے لئے۔ خوابگاہ کے اندر سائرن طبل جنگ کی مانند بج رہا تھا۔ بات واقعی

حیرانی کی تھی۔ اسکی بیوی نے بتایا کہ خوابگاہ میں کوئی ایسی مشینی شئے بھی نہیں ہے جس سے سائرن بج سکتا ہو۔ البتہ رات گئے تک وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ روشنی میں مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لئے میں باہر ڈرائنگ روم میں آکر سوگئی۔ خدا نہ کرے کہ اندر کوئی بدروح داخل ہوگئی ہو۔ اندر سے دروازہ بھی بولٹ تھا۔ بہت کھٹکھٹایا گیا مگر نہ کھلا۔ ادھر آواز کان پھارے دے رہی تھی۔ لوگوں کی ایک بھیڑ بنگلے کے وَنڈ میں جمع ہوچکی تھی۔ آواز گھٹنے کی بجائے اور اونچی ہوتی جارہی تھی۔ گھر والوں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ پاکر باہر کے لوگ سراسیمہ ہورہے تھے۔ بیوی نے بڑی بے چارگی سے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ دروازہ پیٹ پیٹ کر نڈھال ہوچکا تھا۔ پر ماں کو ہراساں دیکھکر اسے رہا نہ گیا۔ زور سے دروازے پر ایک لات ماری اور دروازہ دھڑام کی گونج کے ساتھ کھل گیا۔

سب نے دیکھا وہ دونوں جھڑوں کو انگلیوں سے چیرے شہتیروں کی جانب اٹھائے زخرے سے گونجتی، لرزتی آواز اکر رہا تھا۔ کوئی تماشا نہ تھا، حقیقت تھی۔ تحیر خیز منظر تھا۔ کوئی مشین نہ تھی، ایک آدم زاد کی آواز تھی۔ بیوی یہ منظر دیکھکر دہل گئے۔ اسکی آنکھوں کے لٹو کٹوروں سے باہر آگئے تھے۔ زبان Vibrant کی مانند اس تیزی سے لپلپا رہی تھی کہ ا یب جانا محال تھا۔ بیوی طرح نزدیک جاکر چیخی۔ ”آواز بند کرو“ مگر پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ پھر اس نے بھی اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیخنا شروع کیا۔ ایک کہرام تھا جو مچ گیا۔ مگر بات کچھ بنتی نظر آئی۔ آوازوں کے تصادم سے گھبرا کر آنکھوں کے لٹو اپنے کٹورے میں سر کے۔ آواز مائل بہ اعتدال ہوئی۔ زبان کی لرزش دھیرے دھیرے کم ہوئی پھر رک گئی۔ اس نے چاروں طرف ایک بھیڑ دیکھی De-focus سے اس کی بیوی کا چہرہ ابھرا۔ خو ·دہ چہرہ۔ اس نے بیوی کا دا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور گلے پر رکھ دیا۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا......... ”میرے گلے پر ہاتھ پھیرو۔ د سب ٹھیک ہے کہ نہیں۔ کہیں کوئی پارٹ غائب تو نہیں۔ بولو، میرے گلے کا ارتعاش محسوس کر رہی ہو نا...... “ بیوی نے پیار سے اس کے گلے کو سہلایا اور بولی کہ سب ٹھیک ہے۔ ساری نسیں اپنی جگہ قائم ہیں۔ گردن جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ سی کھروچ بھی نہیں آئی۔ مگر یہ کیسا پاگل پن ہے؟

.....'' پاگل پن نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے نر میں لے لیا تھا۔ سب کے سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ سب مجھ سے میری آواز چھین لینا چاہتے تھے۔ لے جانا چاہتے ہیں میری آواز کو...... انہیں میری آواز کی ضرورت ہے۔ ہاتھی کے سونڈ جیسی مشین تھی ان کے پاس، اس سے میری آواز Suck کر رہے تھے۔ مگر انہیں کیا پتہ کہ میرے کلیجے میں حبشی کی آواز ہے۔ گلا کٹ جائے، آواز گھٹ نہیں سکتی۔ دراصل میں مدافعت کر رہا تھا کہ اصل آواز کی حفا لازمی ہے۔ صدیوں سے اسکی حفاظت کی ہے۔ آج کیسے کو لے جانے دوں۔ جانتی ہو، وہ میری آواز کا استعمال کر کے مجھ جیسا مما چاہتے ہیں۔ میں کوئی اور ہو جاؤں ا، کوئی ور میں ہو جائے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونے دونگا۔ دیکھا نہیں جب میں نے اپنی آواز سے انکے لشکر پر حملہ کیا تو سب کے سب فضا میں بکھر گئے۔ باہر تمہیں لاشوں کے چیتھڑے ملیں گے۔ بہت بڑا Crash تھا۔ لوگوں نے کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے۔ جاؤ باہر جاؤ۔ جا کر دیکھو۔'' بیوی نے کہا یہ بھیڑ نہیں ہے یہ سب ا بہی خواہ ہیں۔ اس نے بہی خواہوں کے چہروں پر اپنی نظریں گھمائیں اور شربت کا ایک گلاس طلب کیا۔ شربت پی کر اس نے ان سب کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے بروقت اسکی خبر گیری کی۔

بچپن میں اسکی آواز پھیکی اور بے کیف تھی۔ اکثر اسکی خواہش ہوتی کہ وہ قلزم کی طرح حمد پڑھے اور لوگ اسکی آواز سنکر دم بخود ہو جائیں۔ قلزم کی خوش الحانی پر اسے رشک آتا۔ جب وہ حمد سرا ہوتی تو پوری جماعت پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مدرسے کے ہیڈ مولوی صاحب آنکھیں بند کیے مبہوت کھڑے سنا کرتے۔ ایک دن حسب معمول قلزم مدرسے کے آنگن میں حمد پڑھ رہی تھی۔

داتا او سنسار کے داتا سب سے اونچا نام تیرا
پیڑ لگانا میری پھول کھلانا کام تیرا

قلزم کی آواز اُسے آج ہر دن کے مقابلے میں زیادہ ہی کیف آور محسوس ہو رہی تھی، اس کے اندر کوئی ایسی شئے پھڑپھڑائی کہ وہ اپنے آپکو روک نہ سکا۔ اپنی صف سے کود کر باہر آیا اور بڑی سرعت کے ساتھ قلزم کے یب پہنچا اور اسے دبوچ کر زمین پر گرا دیا۔ ا ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے۔ آواز بند ہوگئی۔ سارے ششدر اور بھونچکے کھڑے

تھے۔ آواز کا سحر ٹوٹا تو مولوی صاحب اسکی اس حرکت پر زور سے گرجے۔ ''نا ہنجار، بے ہودہ، چھوڑ دے...... '' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر مولوی صاحب لپکے اور اسکی گردن پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا۔ وہ جھٹکا کھا کر دور جا گرا۔ قلزم چیختی ہوئی مولوی صاحب کے میز کی طرف بھاگی۔ مولوی صاحب کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ مہندی کی شاخ سے تراشی ہوئی چھڑی نکالی۔ اس اثنا میں وہ زمین پر کھڑا ہو چکا تھا۔ چھڑی دست قہار میں تازیانہ جیسی تھی۔ مگر وہ بڑی بے خوفی سے کھڑا تھا۔ مولوی صاحب جب بالکل قریب آگئے تو اس نے احتجاج کیا۔

''خود نہیں گیا تھا۔ قلزم کی آواز نے بلایا تھا۔ جادوگرنی ہے قلزم...... اس سے کہیئے کہ وہ پڑھتی جائے...... پڑھ قلزم...... پڑھو...... اسکی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، ہونٹوں پر بدبداہٹ تھی۔ ''پڑھو پڑھو''

ادھر مولوی صاحب نے اتنی بیدیں رسید کیں کہ وہ تقریباً بے ہوش ہو گیا۔ پھر اسے بیہوشی کے عالم میں چار لڑکے ٹانگ کر اسے گھر پہنچا آئے۔ اسکی آنکھ کھلی تو اپنے گھر میں تھا۔ چہرہ، گردن، پیٹھ، ہاتھ سبھی لہولہان تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ بے طرح رویا۔ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ مگر آج ماں نے بھی اس سے ہمدردی نہیں جتائی۔ مولوی صاحب، ماں، بابا...... آخر آج ان سب کو کیا ہو گیا۔ بڑی مشکل سے وہ چانپا کل تک گیا۔ بدھنے میں پانی بھر کر کسی طرح ہاتھ منہہ دھویا۔ پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ جزدان سے بڑی کتاب نکالی اور رحل پر رکھ کر قرآت شروع کی۔ اسکی آواز میں حیرت انگیز گونج کی کیفیت تھی۔ آواز سن کر ماں دوڑی آئیں۔ بولیں...... ''یہ کیا ہو ارے۔ تو تو کوئی اور ہو گیا۔ یہ من موہک آواز...... تو ہی پڑھ رہا ہے بڑی کتاب !!''

''کوئی اور نہیں ہو گیا اماں۔ میں ہی ہوں۔ یہ میری ہی صدا ہے۔ اب میں اپنی ہی صدا پر سر دھونو نگا اماں۔ قلزم کی آواز پر نہیں۔ مولوی صاحب ماریں گے پھر، چمڑی ادھیڑ لیں گے'' اسکے آنسو زخموں پر مرہم بن کر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اماں نے دوڑ کر گلے لگایا۔ بہت دلار کیا۔ ''مولوی صاحب کو سمجھا دونگی۔ اب وہ نہیں ماریں گے۔ قلزم کو دور سے ہی سننا۔ وہ جل ترنگ ہے۔ جل میں کوئی بھی شئے چاہے چھوٹی سی کنکری ہی کیوں نہ ہو پھینکنے سے ترنگیں بکھر جاتی ہیں۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ بیٹے دھیان میں رکھنا۔ چلو دودھ پیلو۔

آنکھیں سوج گئی ہیں تمہاری۔ چہ چہ نہیں روتے۔ آؤ چلو بابا بھی پوچھ رہے تھے۔" دھیرے دھیرے اسکی آواز ہی اسکی شناخت بن گئی۔ لکچر روم، سیمنار، ریڈیو، ٹیلی ویژن مباحث ہر جگہ اس کی آواز کا تسلط تھا۔ عمر کے ڈھلتے ہوئے ایک موڑ پر اسے محسوس ہوا کہ اسکی آواز نے دنیا کی ساری آوازوں کو مسخر کرلیا ہے۔ اس کا یہ احساس تبسم بنکر تا دیر اسکے ہونٹوں پر قائم رہا۔

جب نوادرات کو مستقبل کے لئے محفوظ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، تو اسکی آواز بھی نادر گردانی گئی اور اسے ریکارڈ کر کے آنے والی پیڑھی کے لئے محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسے نہایت عزت واحترام کے ساتھ ریکارڈنگ کے لئے مدعو کیا گیا کہ وہ اب ایک قومی اثاثہ بننے جارہا ہے۔ ریکارڈنگ مکمل تو ہوگئی مگر ماہر صدابندی اسکی آواز سے مطمئین نہ تھا۔ اس کا ریمارک اسکے کانوں تک پہنچ گیا۔ اسکے دل میں ایک کھٹکا سا لگ گیا۔

وہ واپس گھر پہنچا۔ چائے پینے کے بعد اک ذرا لیٹا۔ پھر اٹھ کر شیلف سے بال جبریل کا ڈیلکس ایڈیشن نکالا اور بہ آواز بلند پڑھنے کی کوشش کی۔ گلے میں خراش سی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر کوئی افاقہ نہ پاکر گھبرا گیا۔ بیوی کو آواز دی اور کہا، دیکھو میری آواز مجھ سے چھینی جارہی ہے۔ بیوی نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس نے پھر ایسا ہی کیا۔ متعدد بار مگر نتیجہ وہی...... کہیں کوئی واقعی اسکی آواز چھین تو نہیں لینا چاہتا۔ وہم یقین میں بدلتا جارہا تھا۔

چند روز بعد ہی اسکے ایک شاگرد کی کتاب کی رسم اجراء تھی۔ وہ تقریب کی صدارت کررہا تھا۔ صدارتی تقریر شروع کی تو الفاظ آواز ڈھونڈ رہے تھے۔ رہ رہ کر کھانسی آرہی تھی۔ جملے ٹوٹ رہے تھے۔ کسی طرح تقریر مکمل کی۔ جب نشست پر واپس آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اسکی نسیں پھولی ہوئی تھیں۔ پیشانی پر پسینہ کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ چہرے سے کرب نمایاں تھا۔ گھر آیا تو بے حد مضمحل تھا۔ اسکی طبیعت کی ناسازی کا سن کر اپنی سسرال سے اسکی آپا بھی آگئی تھیں۔ انہوں نے بھی سمجھایا...... "بے وجہ ہلکان ہوتے ہو۔ گلے میں نزلے کا اثر ہے جو علاج چل رہا ہے چلنے دو۔ ٹھیک ہو جائیگا اور تم بولتے بھی بہت ہو۔ گلے کو ذرا آرام نہیں۔"

"ہاں! ہاں! بولتا بھی بہت ہوں۔ اسلئے تو مجھ سے میری آواز چھینی جارہی ہے۔ یہ سب سازش ہے۔ سازشی جانتے ہیں کہ اس آواز میں بلا کی تاثیر ہے۔ ایک ذرا بلند ہوئی تو

طنابیں ہل جاتی ہیں۔ خیمے اکھڑ جاتے ہیں۔ میں اپنی آواز کی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔"

یہ وہی فیصلہ کن رات تھی۔ جب اسکی آواز سائرن بنگئی تھی۔ اس رات کی صبح ہوئی رات پھر آئی۔ پھر صبح۔ یوں ہی دن رات صبح نکلتے گئے۔ بیوی نے بہت کوشش کی کہ وہ بولے، بات کرے۔ مگر وہ نہیں بولا۔ باتیں اشاروں میں کرتا، گویا انگلیاں اسکی زبان بن گئی تھیں۔ گھر کے افراد اسکی اس حالت سے پریشان تھے۔ متعدد ڈاکٹروں نے دیکھا۔ طرح طرح کے نسخے آزمائے گئے۔ مگر اس کا مون نہ ٹوٹا۔

ایک صبح ایک بات ہوئی۔ تڑکے ہی اسکے کمرے میں ایک آواز ابھری "سبحان اللہ، جزاک اللہ"...... "مرحبا"...... بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بول رہا تھا۔ اسکی باز گوئی کی خبر دینے وہ کمرے سے باہر گئی۔ بچے سب سوئے ہوئے تھے۔ آپا جانماز پر نماز کی آخری رکعت ادا کر رہی تھیں۔ سلام پھیرتے ہی اس نے اسکی باز گوئی کا مژدہ آپا کو سنایا۔ وہ اسکو بولتا دیکھنے کے لئے دوڑ کر کمرے میں گئیں۔ وہ جیسے وجد میں تھا۔ ہونٹوں پر سبحان اللہ...... مرحبا...... کا ورد جاری تھا۔ آپا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، فرط جذبات میں انہوں نے اسکو آواز دی ...... بھائی!!

چند لمحوں کے لئے وہ اس کیفیت سے باہر آیا۔ اسکی نگاہیں کھلی کھڑکی پر اب بھی مرکوز تھیں۔ آپا سے استفسار کیا۔

"کون تلاوت کر رہا ہے؟"

"سروش......" آپا نے بتایا۔

"کون سروش؟"

"یاد ہے وہ مدرسے والی قلزم۔ قلزم کی بیٹی ہے سروش۔" آپا بولیں...... "بنتِ قلزم ...... سبحان اللہ۔ کل شئی یرجع الی اصلہ۔ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ کہکر اس نے چپ سادھ لی۔

ایک انت چپ!!

☆☆☆

در آید

عجیب کشمکش تھی جس میں وہ مبتلا تھا۔

اسکی آزردگی میں اور بھی اضافہ ہوتا جب وہ اپنے اندر جاری کشمکش کے اظہار سے خود کو معذور پاتا۔ معذور اسلئے کہ اسے یقین کی حد تک یہ خدشہ تھا کہ کشمکش کے سیاق کا حال زبان پر آتے ہی لوگ ہنسیں گے۔ خدشات نہ جانے کیوں اسکی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ قیاس یہ بھی تھا کہ خدشات ہی اس کے اندر ہونے والی کشمکش کے جنم داتا ہیں۔

سگریٹ پیتے پیتے باتیں کرتے کرتے وہ ٹھٹھک جاتا...... گھورتا جاتا۔ کسی خاص نقطے پر نظروں کو مرکوز کر کے۔ یہ سلسلہ لامتناہی نہیں مگر دراز ضرور تھا۔ وہ آپکو خود میں واپس

لاتا تب جب کوئی اسے ٹوکتا۔

اس کے دوستوں نے کئی بار سمجھایا کہ وہ اپنے موضوع سے تجاوز نہ کرے۔ باہری باتوں پر غور وفکر ترک کردے۔ ہم کاروں کا یہ خیال تھا کہ وہ ایک بے مثال ٹیچر ہے۔ اسے چاہئے کہ ریپوٹیشن کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے گیان دھیان کو Subject تک محدود رکھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ بیک وقت کئی موضوعات ایک ساتھ ذہن کے مختلف خانوں میں بٹور کر رکھنے سے پیٹ کی طرح دماغ بھی چلنے لگتا ہے۔ مگر اوروں کے ماننے اور خود اس کے مفروضوں میں کبھی مصالحت نہیں ہو پاتی۔

کل ہی کی بات ہے۔

دوستوں کی کہی ان کہی سب ایک طرف۔ یہ سوچ کر کہ جاتی ہوئی سردی اور آتی ہوئی گرمی کے درمیان حرارت کو متوازن کرنے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اور ایسے مرحلے میں فریج کے اندر رکھے متفرقات ایک خاص کشش کے مالک بن جاتے ہیں۔

اس نے فریج کھولا۔

کھولتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ برقی جھٹکا۔ جیسے فریج کی ساری باڈی میں کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ ایک زوردار جھٹکے سے اس نے فریج کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ہونٹوں پر کپکپی تھی۔ چہرے پر ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ اضطرابی کیفیت میں مبتلا وہ بیوی بچوں کو ایسی ویسی سناتا رہا۔ ان کے لاکھ کہنے پر بھی نہ مانا کہ فریج میں ساری چیزیں وہی ہیں۔ حسب معمول وہی جو وہ جے گڑھ بازار سے لاتا ہے۔ ایسا کیا ہوا کہ فریج کھولتے ہی لرزنے لگا؟

''وہ اندر بیٹھا ہے۔ کیسے گھسا وہ ہماری فریج میں؟'' چہرے پر ابھرے ننھے ننھے قطرے بڑے ہو کر فرش پر گر رہے تھے۔

''تم تو ایسے ہڑبڑائے جیسے یک بارگی سانپ دیکھ لیا ہو۔''

''گاؤں میں تم کچھوے دیکھکر ڈرا کرتی تھیں۔ فرق ہے کچھوے اور سانپ سے ڈرنے میں۔'' وہ فریج کا ہنڈل پوری قوت سے دبائے ہوئے تھا۔ اس ڈر سے کہ جو اندر بند ہو گیا ہے کہیں باہر نکل نہ آئے اسکی بے چینی بیوی پر بھی طاری تھی۔ کیا ہوا فریج کھولتے ہی۔ کہیں

واقعی کوئی سانپ۔ مگر ۲۰-۲۲ برس ہو گئے گاؤں چھوڑے آخری بار کرینت سانپ انہوں نے گاؤں ہی میں دیکھا تھا۔ کمہر والے گھر میں نکلا تھا۔ شائیں شائیں کی پھنکار پر آنکھ کھل گئی تو دیکھا چھت کی شہتیر سے لٹک رہا ہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سیاہی مائل چت کبرا کرینت یوں چمک رہا تھا۔ جیسے کسی نے روپہلا ہنٹر لٹکا دیا ہو۔ انکی بھی آنکھ کھلی تو دیکھکر بستر سے کئی فٹ اوپر اچھلے اور دھپ سے بستر پر واپس آرہے۔ دھپ کی آواز پر سانپ نے رسی کی طرح دم کو میٹرھا۔ اور پھن کاڑھ کرتن گیا۔ ان کے سر کے اوپر۔ انکی ذراسی جنبش پر پھوپھیایا یوں کہ اب بستر پر کود پڑے گا۔ ان پر لرزہ طاری تھا حالانکہ گاؤں کے گھروں میں سانپ نکلا ہی کرتے ہیں۔ اسلئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کہتے ہیں کچی ماٹی میں سانپوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ ان دنوں گاؤں میں کچی ماٹی ہی ہوا کرتی تھی۔ پکی ماٹی کی بس اینٹ ہوا کرتی تھی۔ ماٹی کی بولی یہ بتاتی ہے کہ یہ سانپ مار بے ضرر ہیں۔

اسکے چہرے پر تناؤ بدستور تھا۔ فریج کی ہینڈل کو اپنی پوری طاقت سے دبائے بیوی کی طرف ایسے تاک رہا تھا۔ جیسے ہلاکت خیز چھلانگ سے پہلے کوئی دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔ بیوی نے تناؤ کم کرنے کی خاطر کہا۔

"فریج میں کوئی زندہ شئے نہیں رکھی جاتی ڈارلنگ یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا۔"

"بکواس مت کرو فریج ہی میں ہے۔ میں کوئی اندھا نہیں ہوں فریج کی چابی لاؤ۔"

"مگر کس لئے۔"

"اسے لاک کر دونگا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے۔ اس کا مدفن بناؤنگا اس فریج کو۔"

اسکی ہٹ پر بیوی نے اسے چابی تھمادی۔ فریج کو لاک کر کے چابی اس نے جیب میں ڈال لی۔

اپنی دانست میں اس نے اس شئے کو فریج میں دفن کر دیا تھا۔ مگر کہیں نہ کہیں کسی راہ، کسی موڑ پر وہ اس کا تعاقب کرتی نظر آتی۔ تب اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی پھر سوچ کے کسی گوشے سے سوال ابھرتا۔

"فریج میں کہیں کوئی Loophole تو نہیں؟"

اسے فریج کی Integrity پر شبہہ ہونے لگا۔ چور سوراخ کا وجود سسٹم کے حوالے سے اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی چوٹ بن گیا۔ جب اسکی نگاہ بند فریج پر پڑتی۔ چوٹ کا احساس شدید تر ہو جاتا۔ وسوسوں نے جیسے اسے انت جال میں گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ جال کہیں مہا جال نہ بن جائے۔ خدشات ہی خدشات۔

آج لیزر پریڈ میں وہ سانیال کے ساتھ پاس والے کافے میں چلا گیا تھا۔ سراسیمہ نظروں سے اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ چند لمحے ہی گذرے ہونگے کہ وہ اچھل کر وہاں سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے کئی میز اور کرسیاں لڑھکا گیا۔ مینجر سے معذرت چاہ کر جب سانیال ٹیچرس روم میں آیا تو دیکھا وہ چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے زور زور سے سانسیں لے رہا ہے۔ سانسیں نہیں تھیں جیسے ہلکی چیخیں تھیں جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سانیال تشویشناک نگاہوں سے بہت دیر تک کھڑا کھڑا ہی تکتا رہا۔ اس نے دھیرے دھیرے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے جیب ٹٹولی۔ چابی نکالی اور غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہی چابی تھی۔ اس کو قدرے سکون ملا۔ سانیال اور دیگر رفقائے کار نے اسے بہت کریدا، جاننے کی کوشش کی مگر وہ مہر بہ لب تھا۔ بات ہی مضحکہ خیز تھی۔ جو اب کیا دیتا اگر بتاتا تو لوگ ٹھہاکا لگاتے اور بس۔ پتہ نہیں کیوں اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی اسکی اس بات کو Share نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ سانیال بھی جو برسوں سے اس کا ہم جلیس اور بہی خواہ تھا۔ اور یہ بھی کہ اسی کے شعبے میں پلاننگ اور پبلک فائنانس پڑھا رہا تھا۔ علم معاشیات کے بے حد اہم اور جدید موضوع ہیں یہ۔ سانیال کو بھی اس سے بڑی عقیدت تھی کہ وہ اقتصادیات کے پیچیدہ اور خشک چیپٹرز کو بھی سہل بنا دیتا وہ حوالوں سے کم حقائق سے زیادہ استفادہ کرتا اور یہی وجہ تھی کہ طلبہ میں معروف و متقبول تھا۔ اسکے پڑھائے ہوئے اسباق Liquid کی طرح دماغ کے سانچے میں اتر جاتے۔

مس کھالکو بھی اسکی اس کیفیت پر حیران تھی۔ کھالکو اسکی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کے ہاتھوں کھالکو کی Grooming ہوئی تھی۔ Delhi School of Economics میں وہ اسی کی بدولت داخل ہوئی تھی۔...... وہاں سے فارغ ہوئی تو اس نے اپنے شعبہ میں ہی ٹیچر رکھ لیا۔

آدیباسی ساخت کی مس کھالکو نے دلی اسکول آف ایکونومکس کے اثرات قبول کئے تھے۔ مگر قبائلی سیرت اس کے اندر اب بھی زندہ تھی۔ اسکی پریشانی اسے بھی ایک انجانے کرب میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ ایک دن پوچھ ہی لیا۔

''سر آپ اتنے Worried کیوں ہیں۔ اچانک کیا ہوا آپکو۔''

''یہی سوال پلٹ کر تم سے کروں کہ تم worried کیوں نہیں ہو تو؟''

''ہوں مگر آپکی الجھن دیکھکر۔''

''تمہاری اپنی کوئی الجھن نہیں۔ میری الجھن تمہاری پریشانی کا باعث ہے۔ گویا میں تمہارا موضوع ہوں۔''

''اگر آپ مان لیں تو یہی سچ ہے۔''

''تمہارا موضوع تمہارا سچ اتنا چھوٹا۔ تم کسی کے جنگل سے باہر ہو۔''

''نہیں سر...... جنگل سے باہر نہیں ہوں۔ اور اب جہاں جنگل نہیں ہے، وہاں جنگل بنائے جارہے ہیں سر۔''

''ہاں میرے اندر بھی ایک جنگل بن رہا ہے۔ ایک ایسا جنگل جسکے پیڑ ڈولتے نہیں۔ شاخیں ہلتی نہیں، پتے ہوا نہیں دیتے۔''

''یہ جنگل نہیں ہے سر۔ یہ بیماری ہے۔ آپکا واہمہ ہے۔''

''واہمہ! کھالکو ہملوگ معاشیات پڑھاتے ہیں، یہ نہ بھولو۔''

''سر میں آپکی اس پریشانی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔''

''میں نہیں بتا سکتا۔ ہنسوگی سن کر۔ میرے لئے وہ عذاب ہے میں، میں......'' وہ بولتے بولتے سیریس ہوگیا۔ چپکے سے جیب ٹٹولی، چابی جیب میں تھی۔

پھر وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ کھالکو اسکی اس ہیجانی کیفیت کو نئے پہلو سے interpret کر رہی تھی۔ کبھی دونوں اکیلے ہوتے تو کامیاب اور ناکامیاب ازدواجی زندگی کی بحث چھڑتی۔ اس بحث میں کچھ دور چلکر وہ اٹک جاتی۔ اور وہ بحث کے آخری سرے پر پہونچ کر تھم جاتا اور انتظار کرتا۔ وہ نہیں آتی اسکے سارے دلائل اور بحث کسی گہری کھائی پر تنکوں سے پل بنانے کے مترادف تھے۔ کہیں کوئی گہری چوٹ چھپی تھی۔ وہ اپنے محسن کے اس

انجانے دکھ کا مداوا نہیں۔

"تھرڈ پیریڈ کے بعد میرا آف ہے۔ آج میرے ساتھ گھر چلئے۔"

"کیوں لے جانا چاہتی ہو گھر؟"

"کوئی بات یا کوئی شئے ستا رہی ہے۔ آپ کو اسی سے فرار چاہئے۔ اس طرح آپکو worried دیکھ کر میں بہت پریشان ہوں اور کالج میں Collegues کے دلوں میں آپکی اس کیفیت کے بارے میں سوال ہی سوال ہیں۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"تو کیا تمہارے پاس کوئی جواب ہے؟"

"جو سوال آپکے بھیتر برسوں سے پک رہا ہے اس کا جواب تھا۔ اور ہے میرے پاس۔ وہ اس کے قریب کھسک آئی۔"

"مگر سوال تو تمہیں کرنا ہے۔"

"جس سوال کا جواب ہو تو وہ سوال کرنا نہیں چاہئے۔ کلاس لے کر آتی ہوں۔ جائیے گا نہیں۔"

وہ دونوں بہت دیر تک گم سم بیٹھے ایک دوسری کی رفاقتوں کو محسوس کرتے رہے۔ مگر اسکی بے چینی بدستور تھی۔ اس نے کپڑے بدل لئے تھے۔ نائٹ گاؤن پہن کر وہ دوسری ہی لگ رہی تھی۔

"ڈرنک بناؤں آپکے لئے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"گھبرائے ہوئے رہنے کی یہ عادت، یہ بے چینی آپ میرے حوالے نہیں کر سکتے سر۔"

"میری بے چینی وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"بے چینی سمجھتی نہیں، محسوس کرتی ہوں۔ ناسمجھی کا الزام نہ لگائیں سر۔ بہت چھوٹی لگنے لگتی ہوں۔"

"تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

"جذباتی ہونا کوئی بری بات نہیں، جذبہ آدمی کا سب سے بڑا Capital ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ میں بھی یہی مانتا آیا ہوں مگر Capital کا قائم رہنا، اس کا

بڑھنا تب ہی ممکن ہے، جب وہ صحیح جگہ Invest ہو۔"

"میرے نزدیک آپ سے بہتر کوئی project نہیں۔ میرے جذبات کی صداقت اسی Project سے وابستہ ہے۔"

"میرا یہ اضطراب کسی جذبے کی صداقت کی جانچ نہیں چاہتا۔ مجھے خوف لگتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ سورج اپنی حدت کی انتہاؤں پر پگھل رہا ہے۔ سارا عالم پگھل رہا ہے۔ وہ پگھلتا ہوا سورج تمہارے کان میں انڈیل دوں تو، کیا تم زندہ رہ پاؤ گی۔؟"

"اونڈیل کر تو دیکھئے۔" کھالکو نے گرفت مزید تنگ کر لی۔ وہ اسکی آغوش میں یوں لگ رہا تھا جیسے کنگارو کا بچہ ماں کے پیٹ سے چمٹا ہر بلا سے محفوظ۔ بلائیں گھیرتیں تو اسے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا کہ............"

کھالکو نے گاؤن کے بند کھولے اور اسکے چہرے کو چھاتیوں کے بیچ دبا کر بولی۔

"جذبے کی صداقت آواز بنکر اٹھ رہی ہے کلیجے سے۔ سن رہے ہیں سر۔ کیا اب بھی آپ اپنی بے چینی کی وجہ مجھ سے چھپائیں گے؟"

اس نے آنکھیں واکیں۔ کھالکو کا عریاں جسم، دراز زلف، پیشانی، آنکھیں، پستان، ناف، ساری ازلی صداقتیں بے پردہ سامنے تھیں۔ اس کا اضطراب آنکھوں سے ہونٹوں پر اتر آیا، وہ گویا ہوا۔

"میری بے چینی تمہیں راکھ کر دے گی۔ ضد کرتی ہو تو سنو! وہ میری فریج میں آکر بیٹھ گیا ہے۔ ہمارے پاس جتنی ڈھنڈک ہے وہ اسے پی لینا چاہتا ہے۔ وہ ٹھنڈک پی لے گا تو ہمارے پاس کیا بچے گا۔ انگاروں کے سوا۔ چارسو گرمی، صرف گرمی، پگھلانے والی گرمی۔ میں ان انگاروں کو اپنے اندر سرخ رنگ ہوتا محسوس کر رہا ہوں۔ میں جل رہا ہوں۔ جوں ہی تم میں داخل ہونگا جل کر بھسم ہو جاؤ گی۔ میں اس تپش سے تمکو، سب کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں"، اتنا کہتے کہتے وہ تڑپ کر بیڈ سے نیچے کود گیا۔ وہ بے حد مضطرب، پریشان اور خوفزدہ دکھائی پڑ رہا تھا۔ کھالکو بے چین، ھراساں اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ پھر وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ بڑے چاؤ سے اسکی طرف بڑھی اور اپنی انگلیاں اسکے بالوں پر پھیرنے لگی یوں کہ Healing Touch دے رہی ہو۔

کھالکو اور اسکے تمام Collegues ششدر رہ گئے جب اس نے کالج کے پرنسپل

کے ذریعہ ضلع مجسٹریٹ کو یہ درخواست گزاری کہ وہ خود کو خطرے میں گھرا محسوس کر رہا ہے۔ کسی لمحے کسی جارحیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسے پستول کے لئے لائسنس دیا جائے۔ ادھر طلبا، نے پرنسپل کو بتایا کہ کلاس میں لکچر دیتے وقت انہوں نے ھدایت دی کہ ہم سب اپنی اپنی بینچ کے نیچے دیکھیں۔ یہیں وہ آکر چھپ نہ گیا ہو۔ جب ہملوگوں نے دھیان نہیں دیا تو خود ہی جھک جھک کر دیکھا۔ پھر بولے دراصل جو کچھ میں تمہیں کلاس میں پڑھاتا ہوں۔ ہم سب کی آنکھوں سے اوجھل ایک شئے اسکی نفی کرتی ہے۔ اسے یہ پسند نہیں کہ تمہارے ذہنوں میں جو شبہات ہیں۔ آپ سے جو سارے سوالات ہیں۔ وہ مٹ جائیں...... Thank God کہ اسے میں نے فریج میں لاک کر دیا ہے۔ مگر بدخواہوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کب نکل بھاگیں۔ لہذا میں نے پستول کے لئے درخواست بھی دے دی ہے۔

ایک دن فرسٹ ایر کلاس میں جب وہ پالیٹکل اکانومی اینڈ کیاؤس پر تعارفی لکچر دے رہا تھا۔ اسکے کلاس کے آخری Row سے پرے ایک ھیولیٰ نظر آیا۔ وہ چیخا خبردار۔ لکچر ڈسٹرب نہ کرنا۔ نکل جاؤ کلاس سے۔ نکلو، دفع ہو جاؤ۔ مگر وہ ھیولیٰ جیوں کا توں رہا۔ تو وہ Riser سے کود کر اس کی طرف لپکا۔ ھیولیٰ دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے پستول نکال لی۔ کلاس کے لڑکے سب Confused تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی دروازے سے باہر بھاگے۔ چند لڑکے اسکے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ھیولیٰ ٹوئلیٹ میں داخل ہو گیا۔ کھولو دروازہ، کھولو دروازہ، آج تم بچ نہیں سکتے۔ زور زور سے دروازے پر لات ماری اور دروازہ کھل گیا۔ گرجدار آواز ابھری۔ "You Bloody Rascal" پھر پے در پے پستول کے کئی شاٹ کی آواز گونجی جب لڑکے دوڑ کر Toilet کے پاس پہونچے تو دیکھا کہ واش بیسن کے اوپر لگا آئینہ چور چور تھا۔ وہ زمین پر گرا بے ہوش تھا۔ ایک بازو اور کن پٹی سے خون رس رہا تھا۔ آئینے پر پڑی ایک دو گولیاں چھٹک کر اسے لگی تھیں۔ پھر اسے امبولینس بلا کر ایمرجنسی وارڈ کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

چند روز بعد وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر گیا۔ تو کھالکو، پرنسپل اور کئی ایک ساتھی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر آئے۔ وہ اب بھی گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ پرنسپل صاحب کو اس نے بتایا کہ اسی دن اس سے چوک ہو گئی۔ آئینہ میں وہ نہیں میں خود تھا اور میں نے اپنے آپ

پر ہی گولی چلادی۔ وہ کمبخت تو میرے فریج میں بند ہے۔ اس نے ان تمام صاحبان کو تاکید کی کہ وہ پھر بھی چوکنا رہیں گے۔ کہ فریج لاک ہے مگر اس کے پاس قوت غیبی ہے۔

بیوی نے بتایا کہ انکی ساری بے چینی کی جڑ فریج میں رکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان لوگوں نے جاننا چاہا کہ کون سی ایسی چیز ہے جس نے انکے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کیا ہے۔ بیوی نے بتایا کہ فریج میں ایسی کوئی چیز میری نظر میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو چیزیں ہوتی ہیں وہی ہیں۔

پھر ان لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ فریج کھولے۔ دیکھا جائے اس شئے کو جس نے اس درجہ سراسیمہ کر رکھا ہے۔ اس نے ٹال مٹول کی۔ کہا آپ سب اسکی موجودگی کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ شاید دیکھ کر ہنسیں گے۔ مگر اس بار سارے لوگ مصر تھے۔ بیوی نے بہت زور ڈلوایا پرنسپل صاحب سے۔ کسی طرح راضی ہوا۔ پھر اس نے بیوی کو چابی دی اور خود سرہانے سے پستول نکالی۔ فریج کی طرف بڑھنے لگا۔ بیوی کو ھدایت دی کہ وہ فریج دوسری جانب سے کھولے۔ بیوی نے ایسا ہی کیا۔ فریج کی سیدھ میں وہ پستول تانے کھڑا تھا۔ بقیہ لوگ اسکے پیچھے کھڑے دلچسپی سے فریج کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی بیوی نے فریج کا دروازہ کھولا وہ چیخا...... ''خبردار باہر مت آنا۔ ورنہ گولی مار دونگا۔'' پھر وہ کھڑے لوگوں سے مخاطب ہوا...... ''دیکھا آپ نے پھر لوٹ کر آگئی ہے وہ بوتل۔ کیسی بیٹھی ہے کنڈلی مار کر ہمارے آب و دانہ پر.........'' بیوی نے بھی حیرت سے دیکھا۔

ارے یہ تو وہی پرانی بوتل ہے؟ جانے کب چپکے سے در آئی فریج میں۔ ہم نے تو کب کا بھلا دیا تھا اس سرد ذائقے کو......... پھر یہ؟

اس نے ایک چوکس سراغ رساں کی طرح جست لگائی اور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف پلٹا۔ ان کی طرف نشانہ باندھ کر چیخا...... ''کہو تم میں سے کس کی شرارت ہے۔؟''

سارے کے سارے اس اچانک ٹرن پر گھبرائے ایک زبان ہو کر بولے......

''یہ ہماری نہیں کسی بچے کی شرارت ہے......!''

☆☆☆

سوکافا[1]

زالونی فیملی کے بلاوے پر مہمان ہوں ۔ جہاں ہوں وہ ڈلیا جان کہلاتا ہے۔ کبھی گھنا اور ہیبت ناک جنگل تھا، اب رونق بیز شہر ہے۔ زالونی تیل کے کنویں کے سرداروں کی فیملی ہے۔ان کا ایک کلب ہے۔ زالونی کلب۔ ہر نئے سال پر ایک تقریب منعقد ہوتی ہے۔ Zaloni Meet کہتے ہیں اسے۔ Zaloni Meet تیل، چائے اور جنگلات کے سرداروں کا سالانہ اجتماع ہے۔ اس اجتماع میں مہمان ہونے کے لئے کڑی شرطیں ہیں۔ اگر مہمان ہو گئے تو فخر کی بات ہے۔ افسوس کہ میں کسی بات پر فخر نہیں کرتا۔ تم اچھی طرح واقف ہو، ہاں فخر کلب کی عمارت کو ضرور ہے۔ اس کے ماتھے پر جھومر کی طرح آویزاں ہے ایک لفظ

ا۔ ایک قبیلہ کا نام جس نے آسام پر سیکڑوں سال حکومت کی۔

''INDIA'' اور اس کے نیچے۔ !-What Not

مسٹر سچدیوا، جنہیں میری میزبانی پر مامور کیا گیا ہے، بڑی اونچی ہستی ہیں۔ تمہیں بتاؤں Confidential رکھنا۔ یہی میرے لئے فخر کی بات ہے۔ میرا میزبان خاص سچدیوا تیل کمپنی میں Geo-Physicist ہے۔ سائنسدان، نرم رو، خوش گفتار۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ سائے کی طرح نہیں لگا رہتا میرے ساتھ۔ کبھی الگ، کبھی ساتھ۔ مہمان کو بوریت سے بچانے کا فن اسے آتا ہے۔ باخبر بھی ہے۔ اس نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ زالونی کسی بستی یا فصل کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ریت کی ایک قسم ہے۔ زالونی۔ کتنی موسیقیت ہے اس نام میں۔ مگر ہے بالو، دانتوں کے نیچے آجائے تو کرکری۔

لو وہ سچدیوا جی آگئے۔ اب جو آئے ہیں تو اس کے ساتھ ۲۵، ۳۰ برس کی ایک خاتون بھی ہیں۔ پہلی ملاقات ہے۔ مگر اجنبی نہیں لگی۔ تعارف ہوا، نام مس برگوھائیں ہے۔ مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ وہ Music Lover ہے۔ میں اس کے لئے Talents اور آرٹسٹ کا Promoter۔ ماڈرن سانگ اور PoP کی دلدادہ۔ زالونی میٹ نام ہے جنگل میں منگل کا، رقص، موسیقی، شباب اور کباب اس Meet کے پیمانے ہیں۔ شب کے گیارہ بج رہے ہیں۔ ایک جنگلی رقص فلور پر جاری ہے۔ برگوھائیں نے اپنے آدھے کپڑے فلور پر گرا دیئے ہیں۔ تھرکتی چال سے آہستہ آہستہ میرے قریب آتی ہے۔ بازوؤں سے پکڑ کر فلور پر گھسیٹ لیتی ہے۔ ایک Pop دھن پر میرے سامنے جسم کو Twist کر رہی ہے۔ میں بھونچکا ہوں، کیا کروں، تم ہی کہو۔ ایسے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے۔ دیہاتی آدمی ہوں۔ کھانا کھانے اور پانی پینے کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہیں۔ بغلیں جھانکنے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔ میں ادھیڑ بن میں تھا ہی کہ سچدیوا آگیا میری مدد کو۔ مس برگوھائیں اور وہ Couple Formation میں جٹ گئے۔ میں آہستہ آہستہ فلور کے کنارے پر واپس آگیا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے پیوست محو رقص ہیں۔ میں اور بھی پیچھے کھسک آیا ہوں، فلور سے الگ بیٹھ گیا ہوں، آکر اپنی پرانی جگہ پر۔ سارا شور ایک طرف۔ میں ایک طرف۔ خاموش، تنہا، بے وجہ۔

ڈبروگڑھ کے ضلع مجسٹریٹ راما سوامی میری طرف لپکے آرہے ہیں۔ انہیں عود

الصلیب کی کوالیٹی والی لکڑیاں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اپنے احاطے میں ایک گودام بنوا رکھا ہے۔ خاص کر ایسی ہی منتخب لکڑیوں کے لئے۔ حالانکہ گھر اور دفتر میں سارے فرنیچر بید کے ہیں۔ ایک زمانہ تھا، ان بڑے افسروں کے ہاتھوں میں بید کے ہنٹر ہوا کرتے تھے۔ تم نے پرانے ناولوں اور افسانوں میں ضرور پڑھا ہوگا۔ مگر آج یہ بید فرنیچر ہیں سامان آرائش ...... راما سوامی پہنچ گئے ہیں میرے پاس۔ ازراہ اخلاق میرے اکیلے پن پر اظہار تاسف کرتے ہیں اور بتاتے ہیں۔

''معلوم نہیں آپ نے اس صوفے کو پکڑ رکھا ہے، یا صوفے نے آپکو۔ بہت سارے اسپاٹس (Spots) ہیں Enjoy yourself-Take a round'' میں ان سے پوچھ رہا ہوں کیسے؟ انہیں حیرت ہے۔ اس خنک رات میں چاروں طرف الاؤ دھدھک رہے ہیں۔ لکڑیاں آتش دانوں میں چیخ رہی ہیں اور میں ایک سوال لئے بیٹھا ہوں۔ کیسے؟ مس برگوھائیں، سچدیوا پکڑ کر لے گئے تھے۔ مگر وہاں بھی وہی سوال آڑے آیا۔ راما سوامی صاحب کی حیرت بیجا نہیں ہے۔ ایک ذرا توقف کے بعد وہ پھر بولے۔

''آپکے دفتر میں جو Agitation چل رہا ہے اس میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ بتائیے دھمکاتا ہوں۔'' شاید راما سوامی دفتر کی بات چھیڑ کر جس دلدل میں ڈوبا ہوں، اس سے باہر لانا چاہتے ہیں۔ مجھے!۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ جس دلدل سے بھاگ کر زالونی میٹ میں آیا ہوں وہ پھر مجھے اسی دلدل میں اتارنا چاہتے ہیں۔ یہ زالونی میٹ ہم افسروں، سرداروں کا سالانہ Escape ہے ...... جائے فرار ...... میں نے ان سے دست بستہ عرض کیا ......

''دفتر سے بھاگ کر ہی یہاں آیا ہوں۔'' میرا جواب سن کر انہوں نے وہسکی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا ہے۔ ممکن ہے اب کہنے کے لئے انکے پاس کچھ نہ رہ گیا ہو۔ چند ساعتوں کے لئے ہی وہ صوفے پر ٹکے ہوں گے کہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر ایک ٹھہاکا لگاتے ہیں ...... زوردار ......

''I have lost my wife'' دوسرا جملہ ہے "who cares" اس جملہ نے جیسے ایڑ لگا دی ہو۔ گھوڑے کی ایک جست جیسی چھلانگ لگائی اور غائب ہو گئے راما سوامی۔

میں ہوں تو خاموش مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے یہ سب؟
میں اپنی اس مسکراہٹ پر حیران ہوں۔ کون نشانہ ہے اس معنی خیز مسکراہٹ کا، ضلع مجسٹریٹ، سچدیوا، برگوھائیں، تم بھی جانتی ہو، میں بھی جانتا ہوں۔ میرے کڑوے ہونٹ پر بے معنی مسکراہٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ کسی سے یونہی الجھ جاؤں۔ اپنی مشکوک مسکراہٹ کا سچ جان لوں۔ پر میں بے تکا سا۔ اس بے مہار محفل میں کوئی نکیل ہی نہیں جسے پکڑ کر کھینچ لوں۔ اب خیال آتا ہے کہ اپنی اس مسکراہٹ کو لیکر کیوں پریشان ہوا جائے، لہذا P.R.O برکاکوٹی کو Locate کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس بھیڑ میں سب کھوئے ہوئے لوگ ہیں۔ اس میں کسی کا ملنا گلگو کے پھول دیکھنے جیسا ہے۔ پھر بھی۔

رات اپنی سہ پہر میں داخل ہو چکی ہے۔ MTDC کے ایر کنڈیشنڈ تحویل میں بند ہوں۔ جدید ترین مہمان خانہ کا یہ بند کمرہ تحویل جیسا ہی لگا مجھے۔ زمین پہ چلنا۔ تم سے لڑنا۔ محبت کرنا...... سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں یہاں۔ نہ جانے کتنے تالوں میں بند کر دیا گیا ہوں۔ میری Security میری حفاظت فرض کی طرح مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔ تمہیں یہ خوب خوب معلوم ہے کہ میرے اندر ایک قبائلی پوشیدہ ہے۔ اور یہ قبائلی جب جب مجھ پر غالب ہوا ہے، مجھے کسی نہ کسی سانحے سے دو چار ہونا پڑا۔ خون کے رشتے زد میں آئے ہیں۔ میرے لئے موت سانحہ نہیں ہے۔ موت سے اس رشتہ کا کتنا سانحہ ہے جسکا کوئی بدل نہیں۔ میرے لئے سانحہ وہ بھی ہے جب میری قبائلی خصلتیں اپنوں کو دکھ پہنچاتی ہیں، دکھ پہنچانا میرا منشا یا میری مراد نہیں، بس وہ ایک لمحہ ہوتا ہے جب قبائلی سر پر سوار ہو کر ناچنے لگتا ہے۔ پھر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہیں تو اچھی طرح یاد ہوگا۔ کیسے کیسے طوفان اٹھائے ہیں میں نے مگر تم اس سے بھی واقف ہو کہ میرے اندر کا قبائلی طوفان تب ہی اٹھتا ہے جب اسے کوئی ٹھیس پہنچاتا ہے۔ اس ٹھیس کی کڑواہٹ برسوں اس کے ہونٹوں پر قائم رہتی ہے۔ اور میں سانحات سے گذرتا رہتا ہوں۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ ایک محفل لالہ زار سے لوٹا آدمی یکا یک سانحات پر کیوں اتر آیا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ تو وہ وجہ تم ہو۔ یاد کرو پچھلی گفتگو۔ کتنی Artificial تھی تم اس گفتگو میں۔ جب ہونٹوں سے من کی جگہ زبان بولے تو میرے اندر کا قبائلی چھلانگ لگا کر باہر آ جاتا ہے۔ مسلط ہو جاتا ہے مجھ پر۔ اور میں فوراً مکھوٹے نوچ ڈالنے

پر اتارو ہو جاتا ہوں۔ اچھا ہواتم اس دن روبرو نہ تھیں، فون پر تھیں۔ ورنہ تمہارے نقلی شبد محل کو میرا قبائلی مسمار کر دیتا۔ شاید تم اور میں ایک بار پھر ایک بے بدل رشتے کے کٹ جانے کے سانحے سے دوچار ہو جاتے۔ خیر۔ اپنے اس قبائلی کو دبائے رکھنے کی کوشش میں ہی زالونی میٹ میں آ گیا ہوں۔ مہمان خانے کی بھیانک تنہائی میں مس برگوھائیں کا رقص کے لئے بلاوا گدگدانے لگا ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ کف افسوس ملنے کے سوا۔ کف افسوس ملتے ملتے مجھے جھپکی سی آنے لگی ہے شاید۔ نہ آنے والی نیند مجھے سونے کا سگنل دے رہی ہے۔ مجھے لگا کہ میں سو گیا ہوں۔ مگر میں سویا نہیں جگا دیا گیا ہوں۔

تمہیں حیرت ہوگی یہ جان کر۔ میری تحویل کے تالے کھل گئے ہیں۔ دروازہ کھل گیا ہے۔ میرے سرہانے کھڑی ہے۔ قبائلی لڑکی مس برگوھائیں۔ چہرے پر جلال و تمکنت۔ تم کیا کیا سوچ رہی ہوگی۔ رات کا آخری پہر۔ کمرے میں نیم عریاں بدمست قبائلی خاتون۔ آنکھ لگنے سے قبل اسکے لئے جاگی ہوئی شہوت۔ کہا جاتا ہے برگوھائیں کا تعلق اس آھوم قبیلے سے ہے۔ جس نے تقریباً سات سو سال تک اس شمال مشرقی خطے پر حکومت کی تھی۔

مس برگوھائیں! مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس سے میری ملاقات پہلی نہیں ہے۔ اس نئی پوسٹنگ پر جوائن کئے ہوئے چند روز ہی ہوئے ہونگے کہ وہ میرے دفتر آئی تھی میرے پاس۔ ہاتھ کی لکیر پڑھنے والی۔ حالانکہ میں ان توہمات پر یقین نہیں رکھتا، پھر بھی انجانے ہی میں میں نے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دھر ا دیا کہ لو پڑھو۔ وہ بہت دیر تک میرے ہاتھ کی ریکھاؤں سے کھیلتی رہی۔ پھر اس نے بتایا "آپکے ہاتھ میں باغی لکیریں ہیں۔" پہلی بار میں ایک دست خواں کی Reading پر چونکا تھا۔ لکیروں کے نیچے دبی لکیروں کو اس نے کیسے پڑھ لیا۔ اس نے مجھ سے دست خوانی کی فیس طلب نہیں کی۔ میں نے اسے اپنے لنچ میں شامل کر لیا۔ مجھے حیرت ہے اس بات پر کہ اس نے لنچ کے بعد بھی مجھ سے کوئی Favour نہیں چاہا۔ جبکہ میرا قیاس تھا کہ دست خوانی کے بہانے لڑکیاں صنف مخالف کی ہتھیلیاں اس لئے سہلاتی ہیں کہ انہیں ان سے کوئی Favour چاہئے۔ ہاں مجھے یاد آ رہا ہے۔ لنچ کے دوران اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ آھوم قبیلہ کی "سوکا پھا" ہے جس نے اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے وحشی درندوں سے لیکر شہری شیروں تک سے ٹکر لی تھی۔ دراصل یہ "سوکا پھا" سات صدیوں کے

ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ جب جب رعایا درد سے کراہتی ہے تب تب ''سوکا پھا'' وارد ہوتی ہے۔ میں نے اس وقت برگوھائیں کی باتوں کو Ethinic برتری کی لن ترانی پر محمول کیا تھا۔

میرے سرہانے وہی برگوھائیں، وہی ''سوکا پھا'' تن کر کھڑی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے یہ برگوھائیں نہیں ہے، بلکہ وہ ملکہ ہے جسے اپنی رعایا کے دکھوں کا علم ہو گیا ہے اور اپنے تاج وتخت کی واپسی کا اعلان کر رہی ہے۔ مگر اس کو مجھ سے کیا ملنے والا ہے۔ میں ادنیٰ سا ملازم میرے پاس نہ اس کا تخت ہے نہ تاج۔ پھر وہ میرے بستر کی طرف بڑھ رہی ہے سرہانے سے سرک کر۔ میرے جسم میں گدگدی تیز ہوتی جارہی ہے کچھ سوچ کر اپنی موٹی رضائی سے باہر نکل رہا ہوں۔

''ناچ ختم ہو گیا مس برگوھائیں'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ختم ہو گیا۔'' جواب میں تلخی تھی۔ ہاتھ بھی جھٹک دیا۔ پھر میں نے ہمت بٹورتے ہوئے کہا۔ ''رات گزارنے کا مسئلہ ہے۔''

''نہیں مسئلہ یہ ہے کہ باہر سخت ٹھنڈک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم مر نہ جاؤ۔ میں تمہیں زندہ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں لے جانے کے لئے آئی ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔''

''مس برگوھائیں!'' میں اس سے ملتجی نظروں سے مخاطب ہوا ! "Come on you bastard" سچدیوا Take him۔''

میں نے مس برگوھائیں کا یہ جملہ سنا ہے۔ تیر وتفنگ دیکھ رہا ہوں۔ حرامزادے جیسے زیور سے آراستہ کئے جانے کے بعد بھیگی بلی جیسی چھینک بھی نکالنے سے قاصر ہوں۔ خاموش قدموں سے ان کے ساتھ چلنے لگا ہوں۔ دروازے سے باہر Corridor۔ پھر انتظار خانہ۔ مین گیٹ پھر لان سے باہر۔ ان انجان قدموں کی منزل ہی میری منزل ہے۔ ایک پڑاؤ آیا تھا۔ وہیں سے لکھ رہا ہوں۔ تم خوش ہونا میری اس سزا پر۔ میں اپنی اس سزا اور تمہاری خوشی کو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ میں بھی مزاحمت کی ہمت تھی۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے اندر بھی ایک قبائلی ہے!!

☆☆☆

پنگا

شیواجی اسٹیڈیم بس اڈے سے گرو تیغ بہادر نگر جانے والی آخری بس کے آنے کا انتظار تھا۔ اڈے پر بسیں آتیں اور گھر.............ر کر کے نکل جاتیں۔ کچھ خالی کرتیں کچھ بھر لے جاتیں۔ دلی مہانگر میں خالی کرنے اور بھر لے جانے کا یہ کھیل مدتوں سے چل رہا ہے۔ اس مہانگر میں تب بھی ایسا کچھ تھا جب غلام بادشاہ بنا تھا۔ فرق یہ کہ پہلے ہاتھی خالی کرتا اونٹ بھر لے جاتا۔ اونٹ خالی کرتا تو خچر۔ ہاتھی، اونٹ، خچر تھک گئے تو مہانگر میں بس آئی۔ اور بس کے ساتھ بے بسی۔ شب و روز ہزاروں لوگوں کو بے سفر کرتی بسیں نہ جانے کن کن سمتوں میں مہنہ اٹھائے بھاگی پھرتیں۔ کسی اڈے پر ٹھہری ایسے جیسے چلتے چلتے ٹھٹھک گئی ہو۔

اور پھر رواں دواں۔ بس کی طرف لپکتے لوگ آدمی نہیں رہتے پاؤں بن جاتے ہیں۔ بھاگتے، دوڑتے، لانگھتے پاؤں۔ مغز، زبان، جبڑے کھسک کر پاؤں کی ایڑی میں چلے آتے ہیں۔ سارا شہر بس کا فٹ بورڈ بن جاتا ہے جس پر لدے ہوتے ہیں انسانی بھیجے ایڑیوں کی صورت، ایڑیوں سے ایڑیاں ٹکراتی ہیں اور بھیجے کھل جاتے ہیں۔

شیڈ نمبر ۱۱ میں بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ ایک بس آئی لوگ اسکی طرف دوڑے مگر وہ بس گرو تیغ بہادر نگر والی نہ تھی۔ اس بس نے بھی کچھ مسافر خالی کیے۔ ایک ادھیڑ عورت اتر کر بڑی تیزی سے شیڈ نمبر ۱۱ کی طرف لپکی۔

"G.T.B نگر والی گئی تو نہیں" عورت نے پوچھا۔

"نئی جی" کسی نے فوراً جواب دیا۔

"میں نے آپ سے کب پوچھا!......"

تو پھر کس سے پوچھا؟

"وہ جو بیٹھے ہیں سردار جی" عورت نے انگلیوں سے دکھایا اور سردار جی کے قریب پہنچ گئی۔

"دسو جی کی گل ہے" سردار جی نے منڈی ہلائی۔

"یہ مہاشے پچھلی بس سے گھٹیا حرکت کررہے ہیں۔ ذرا شکل دیکھئے انکی۔"

"کیوں جی کہاں جانا ہے آپ نے؟"

"آپ کنڈکٹر ہو! کیوں بتاؤں آپکو"

"ہوں تو نہیں پر دس برسوں سے کنڈکٹ کررہا ہوں۔"

"تو اس سے میرا کیا"۔

"اس آدمی کا دماغ درست کرنا ہے سردار جی"، عورت غصے میں چیخ رہی تھی۔

"دسو جی میڈم کیا کیا ہے اس نے؟"

"لچا ہے، لچا۔"

"کیوں جی آپ کام کیا کرتے ہو؟"

"اب کیا کرنا دھرنا۔ پنشن لیتا ہوں"

''اس عمر میں یہ حرکت !''

''کیسی حرکت؟ میں سمجھا نہیں'' اسے کھٹ پٹا سا لگا۔

''یہی کہ میڈم کو۔''

''ہاں ہاں ۔ کیا ہوا میڈم کو'' اسکی زبان لڑکھڑائی۔ عورت نے اسے خشمگین نگاہوں سے دیکھا۔

بس اڈے پر منتظر لوگ آہستہ آہستہ اس غیر واضح واقع کی طرف مڑنے لگے۔ سردار جی نے اس آدمی کو ایک طرف بٹھایا۔ عورت دوسری طرف بیٹھ گئی۔ تینوں نے ایک دوسرے کو پھر تاکا۔ سردار جی کی آنکھوں میں دوویدھا کی کیفیت تھی۔ عورت جیسے بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہو۔ متنازعہ شخص بیگانگی پر مصر تھا۔ سردار جی نے ترکش سے تیر نکالا اور داغ دیا بیگانے پر۔

''ہاں جی ساٹھ برس کے ہو کر؟''

''کوئی جرم ہے ساٹھ برس کا ہونا''

''آپ تنگ کیوں کر رہے ہیں۔''

''کون تنگ کر رہا ہے اور کیسے؟''

''میڈم کیا یہ آدمی آپکو تنگ نہیں کر رہا ہے......'' عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔

''واہ ری الٹی گنگا...... شروعات تو اسی نیک بیوی نے کیا ہے۔''

''کیسی شروعات؟......'' سردار جی نے وضاحت چاہی۔

''جس بس سے اس اڈے پر اترا ہوں اس بس میں یہ بھی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا تھا اچانک گرجنے لگی۔ بولی مار جوتوں کے سر گنجا کر دونگی۔''

''کیوں میڈم...... یہ کیا کہہ رہا ہے'' ایک اور منتظر مسافر مکالمے میں داخل ہوا۔

''کوئی بھی لیڈی ہوتی تو یہی کہتی'' عورت سلگتی جا رہی تھی۔

''مگر بلا کسی کارن...... یہ کہنا...... کیوں کہا اس نے؟'' نو وارد بولا

''بابا جی، بوڑھوتی میں زیادہ کھانا پینا دیہہ چلانا ٹھیک نہیں ہے......'' ایک نوجوان نے ٹوکا ''میں کسی کے باپ کی کھاتا ہوں چلانے کے لئے دیہہ تم سے مانگوں!''

''دیکھو بھائی صاب۔ بہن جی نے چپل یا جوتے مارنے کی دھمکی بے وجہ نہیں دی

ہوگی۔" بس کے لئے منتظر مسافر دھیرے دھیرے اس پنچایت میں جواب طلبی کے ارادے سے شامل ہونے لگے۔ پنشن یافتہ وجہ جاننے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ آخر اس نے سر گنجا کرنے کی دھمکی کیوں دی؟

"کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی......" ایک نے بڑے وثوق سے یہ جملہ تھرو کیا۔

"زیادہ بحث تکرار کی ضرورت نہیں معافی مانگ لو"

"کس بات کی معافی۔ بے بات کی معافی تو اوپر والے سے بھی نہ مانگوں"

"گھر سے نکلتے وقت شرافت کا جامہ پہن لیا کرو۔" کسی نے آواز لگائی۔

"پبلک پلیس میں تمہاری یہ حرکت اوچھی ہے۔" ایک نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"واہ صاحب واہ! آپ تو بڑے کورٹ کے جج ہو گئے۔ اس عورت سے بھی پوچھیے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔؟" عورت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ لوگ پھر اس پنشن یافتہ پر پل پڑے۔

"آپ اس لائق ہو کہ آپ کو اس بس پر چڑھنے نہ دیا جائے۔" ایک شخص مکا تانتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ کیا بس تمہاری خریدی ہوئی ہے۔"

"میری نہیں مگر پبلک کی ہے، اور پبلک کا حکم ماننا ہی پڑے گا۔"

"تو کیا میں پبلک نہیں ہوں؟"

"یہاں جو ۵۰ لوگ کھڑے ہیں ڈیلی پسنجر ہیں۔"

"آخری بس پر جانے والوں کا ایک سماج ہے" دوسرے نے وضاحت کی

"بھائی مجھے بس میں جانا ہے سماج میں نہیں" پنشن یافتہ چڑھ کر بولا۔

"تم اس سماج کے قاعدے قانون کا النگھن کر کے بس پر سوار نہیں ہو سکتے۔"

"تو اب آپ کا یہ سماج مجھے کنڈکٹ رولس سکھائے گا۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"اونچی آواز میں بولو گے تو بس اسٹنڈ سے اٹھا کر باہر پھینک دیئے جاؤ گے۔"

"بڑے آئے پھینکنے والے۔ دیکھ لونگا۔"

"او بڈھے درگت بن جائیگی۔ شرم نہیں آتی۔ چوری اور سینہ زوری۔"

ہر شخص پنشن یافتہ کو زیر کرنے پر تلا تھا۔

''تو بات کیا ہوئی تھی میڈم'' فرنچ داڑھی والا پسنجر بولا

''راج گھاٹ سے بس پر سوار ہو رہی تھی تو پیچھے سے۔''

''خود لپک کر آگے آگئی تھی تو مجھے پیچھے ہونا ہی تھا۔'' اس نے بات کاٹی۔

''سالا پی کر نکلا ہے۔ کوتوالی بھجواؤ۔'' بس کی گھر گھراہٹ پر کان لگائے ہوئے ایک آدمی بولا۔

''بس آرہی ہے کیا'' دوسرے نے استفار کیا۔

''تو سسٹر ہوا کیا تھا۔ بات وہیں رہ گئی۔''

''بات تو وہیں رہے گی''، پنشن یافتہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''شٹ آپ! ساٹھا ہو گئے پر عورتوں سے بیوہار کا طریقہ نہ آیا۔''

''میں کہتا ہوں آپ لوگوں نے مجھ پر یہ پنچایت کیوں بٹھا رکھی ہے۔''

''پتہ چل جائیگا۔ آنے دو سیناپتی جی کو۔ اب آتے ہی ہونگے۔''

''کیا کرلیں گے سیناپتی اور فلڈ مارشل مرا۔''

''وہ اس آخری بس پسنجر سنگھ کے مکھیا ہیں۔''

''تو کیا میں کسی گاؤں یا کسی گھر میں بیٹھا ہوں۔ D.T.C کا بس اڈہ ہے۔''

''ہم لوگ برسہا برس سے ایک ساتھ اس آخری بس پر سواری کر رہے ہیں۔''

''پھر''

''ہماری آدھی زندگی، آدھا گاؤں، آدھا پریوار یہ بس اڈہ ہی ہے۔''

''اور تمہیں کیا معلوم کہ آخری بس کا انتظار ہی ہماری پنچایت ہے۔ یہیں اس بس اڈے پر سیناپتی جی نے کتنے فیصلے کیے ہیں۔''

''سردار جی! یاد ہے نہ آپکو ایک بار گر بھوتی گلشن کو اس کے پتی کالو نے کس بری طرح سے پیٹا تھا۔ بیچاری دفتر سے اور ٹائم کر کے اسی آخری بس سے گھر جاتی تھی۔ دفتر کا بہادر اسے چھوڑنے آتا تھا۔ ایک دن کالو بس اڈے پر خود ہی آگیا تھا۔ بیوی کو بہادر کے ساتھ آتے دیکھ کر لات جوتوں سے شروع ہو گیا تھا۔ تب ہی سیناپتی جی نے کالو کی گردن

دبوچ لی تھی۔ کسی کی کیا مجال کہ سیناپتی جی کے رہتے بس اڈہ کے ممبر پر کوئی ہاتھ اٹھائے۔"

"واہ جی واہ! اب میاں بیوی جھگڑے بھی نہ کریں!" پنشن یافتہ نے استفہامیہ لہجے میں بات کاٹی۔

"میاں بیوی گھر پر۔ یہاں اس جگہ وہ بس اڈہ سماج کی سدسیہ ہے۔ ممبر ہے۔ کیا قصور تھا اس کا۔ یہی کہ بس اڈہ تک بہادر کے ساتھ آئی تھی۔ اور ٹائم کے پیسے تو کالو ہی ڈکار جاتا تھا۔"

"سیناپتی جی نے کالو جی سے ناک رگڑ وائے۔ معافی منگوائی۔ پھر گلشن کے لئے سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔"

"میں کالو نہیں، میں ایک ریٹائرڈ افسر ہوں۔ تجربے ہیں میرے پاس۔ اپنے کار یہ کال میں میں نے خود ہی کتنی معافیاں دی ہیں۔" پنشن یافتہ ایک گھاگھ بورو کریٹ جیسا ہونے لگا۔

"اوئے کھوسٹ کیوں اپنی شامت بلا رہا ہے۔" خونچے والا لپک کر آگے آگیا۔

اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ بس آیا ہی چاہتی ہے۔ سیناپتی کو بھی آ ہی جانا چاہئے۔ یہ ریٹائرڈ بڈھا تو پنگا لے رہا۔ بے فضول۔"

"پنگا! کیوں لونگا پنگا...... کون ہوتے ہو تم لوگ فیصلہ کرنے والے۔" اجنبی اس بار بے حد گمبھیر تھا۔

"فیصلہ تو ہوگا ہی۔ ہاں! کیا ہوا تھا سریتا جی۔"

"جی میں کہہ رہی تھی کہ یہ رنگا سیار میرے پیچھے پیچھے بس پر چڑھا۔"

"خبردار جو مجھے رنگا سیار کہا۔ عورت نہ ہوتی تو گدی سے زبان کھینچ لیتا"، بوڑھا بھڑ کا۔

"بوڑھو کا بلڈ پریشر تک اوپر اٹھ گیا ہے۔ وہ رہے سنیاپتی جی لو وہ آگئے۔" بیساکھی کھٹ کھٹ بجاتے وہ بھیڑ کی طرف ہی آرہے تھے۔ بس اب آنے ہی والی ہے۔ سارے معاملے یک لخت رک گئے۔ شاید سیناپتی جی کے احترام میں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ گرو تیغ بہادر نگر بس روٹ کے بانی یہی تھے۔ اس سے قبل گرو تیغ بہادر نگر جانے کے لئے مسافروں کو کئی

بسیں بدلنی پڑتی تھیں ۔ سیناپتی جی کے پاؤں کے بیکار ہونے کا بھی ایک قصہ ہے۔ جب انکی ٹانگیں اچھی تھیں تو وہ کسی لاغر، نحیف، یا لیڈیز کو کھڑے دیکھتے تو اپنی سیٹ سے اٹھ کر انہیں جگہ دیتے ۔ کنڈکٹر کو برابر ھدایت کرتے راہ میں کوئی چھوٹ نہ جائے کہ یہ آخری بس ہے۔ اگر کسی کے پاس چھٹے نہ ہوتے تو وہ اس کے لئے اپنی جیب سے ٹکٹ لیتے ۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بس اڈے پر انتظار کی گھڑیاں انکی موجودگی میں بار نہ گزرتیں ۔ جیسے وقت انکے وجود کی حرارت سے پگھل کر صفر ہو جاتا ہو۔ ایسے ہی کوئی وقت صفر ہو رہا تھا کہ ایک بار بس حادثے کا شکار ہوئی ۔ بس کا پچھلا چکا ایک بچے کو کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ ہمارے مسافر گھبراہٹ میں کود کود کر ادھر ادھر بے دھران بھاگے ۔ بس پر رہ گئے سیناپتی جی ڈرائیور کو گن دھلائی (Public Lynching) سے بچانے کے لئے ۔ مشتعل پبلک نے سیناپتی جی کی ٹانگ بیکار کر دی ۔ تب سے بس کے اسٹاف اور آخری بس سے جانے والوں میں ان کا بڑا نام اور احترام ہے ۔ جب کبھی کوئی قضیہ یا تنازعہ کھڑا ہوتا تو سیناپتی جی ایک حوالہ بنکر ان کے درمیان کھڑے ہو جاتے ۔ سیناپتی جی بھیڑ میں داخل ہوئے ۔ اس عورت کے قضیے کا فیصلہ حسب معمول ان کو سونپ دیا گیا ۔ بس آج کچھ زیادہ ہی Late ہو رہی تھی ۔ حالانکہ روز ایسا نہیں ہوتا ۔ مگر لوگوں میں اکتاہٹ نہیں تھی ۔ سیناپتی جی شیڈ میں پہنچے اپنی بیساکھی الگ کی اور ہولے سے ولایتی مائی سے بنی کرسی پر بیٹھ گئے جوان کے لئے خالی کر دی گئی تھی ۔ مقدمہ انکی عدالت میں پیش کیا گیا ۔ سیناپتی جی نے پنشن یافتہ نووارد سے پہلا سوال کیا ۔

"ہاں تو بھائی صاحب آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور اس بس اڈے سے آپکو کہاں جانا ہے۔"

"میں کسی بھی بس اڈے سے کہیں بھی جاؤں ۔ میری مرضی آپلوگوں سے مطلب ! آپکو پتہ نہیں بھارت کے ہرناگرک کو سمبدھان دوارا کہیں بھی آنے جانے کی چھوٹ ہے۔" اجنبی نے ہندوستانی دستور کا سہارا لیا ۔

"بھکومت برادر اس بس اڈے پر سمبدھان نہیں چلتا ۔ یاتری سنگھ کے نیم چلتے ہیں ۔ اور سرتیا اس آخری بس یاتری سنگھ کی ممبر ہے ۔ اسکے بھلے برے سے ہمارا واسطہ ہے اور اسی واسطے سے سوال کرنے کا حق ہے مجھے ۔"

''لیکن میرے اس بس اڈے پر ہونے سے ان کے بھلے برے کا کیا تعلق ۔ میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔''

''سرتیا اب بتاؤ ہوا کیا تھا۔'' عورت نے ایک بار پھر پنشن یافتہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں! ہاں! بولو سرتیا۔'' سینا پتی جی نے عورت کی ہمت بندھائی۔

''یہ بس میں میرے پیچھے سوار ہوا۔ پھر میرے ساتھ ہی لیڈیز سیٹ پر بیٹھ گیا۔''

''جگہ خالی تھی تو بیٹھ گیا، سب ہی بیٹھتے ہیں'' اجنبی نے صفائی پیش کی۔

''ساتھ بیٹھ گئے۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی'' سینا پتی جی نے منصفانہ بات کی۔

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ اجنبی شخص کو اپنی حمایت میں ایک اکیلا جملہ اچھا لگا۔

''مگر سینا پتی جی میری بات ادھوری ہے''۔ عورت ایکدم سے بولی۔

''ہاں! ہاں! بیٹھنے کے بعد کیا ہوا۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

''بیٹھنے کے بعد یہ میری طرف ۔'' اتنا کہکر وہ رک گئی۔ مجمع میں ایک تجسس سا پیدا ہوگیا۔ ان کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ سب کے سب کچھ سننا چاہتے تھے۔ شاید وہی جو وہ صدیوں سے جانتے ہیں۔ مگر عورت کی ان کہی کو اسکے منہہ سے بار بار سننا چاہتے ہیں۔

''ہاں ہاں! کہو۔ آگے بتاؤ۔ کیوں رک گئی۔ وہ تمہاری طرف۔ پھر اسکے بعد؟ اس کے بعد۔'' اسکے بعد۔ عورت کی زبان کو لکنت نے پکڑ لیا۔

''کوشش کرو۔ بولو۔ اس کے بعد!'' مجمع کی گڑی آنکھیں اسے ادھیڑے دے رہی تھیں۔ ''اس کے بعد۔ یہ کھوسٹ۔'' اسکی آنکھوں نے ایک بار پھر مجمع کا جائزہ لیا۔

''اس کے بعد۔''

......اور اس کے بعد ہوا یہ کہ آخری بس آگئی۔ سارا مجمع پاؤں بن گیا۔ پاؤں کی بھیڑ میں صرف ایک بیساکھی تھی سینا پتی جی کی۔ عورت سمیت سب ہی بس کی طرح جھپٹے۔ چند ہی لمحوں میں اڈے کے سارے مسافروں کو لیکر بس تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ مگر سڑک پر رہ گئے تھے سینا پتی جی بھگدڑ میں کچھ پاؤں نے بیساکھی کو لنگی ماری تھی۔ بیساکھی اور وہ دونوں

بکھر گئے تھے سڑک پر۔ اٹھنے کی کوشش کی تو ڈگمگائے۔ دوبارہ کوشش کی۔ اس بار جو ڈگمگائے تو پیچھے سے کسی نے سہارا دیا۔ مڑ کر دیکھا۔ وہی نو وارد پنشن یافتہ۔

"تم گئے نہیں۔" سیناپتی جی کی آنکھوں میں گہرا استعجاب تھا۔

"میں کہاں جاتا۔ آپ کا فیصلہ جو سننا تھا۔"

سیناپتی جی نے بڑی بے بسی سے اسکی طرف دیکھا۔ مگر یہ بے بسی بس والی بے بسی نہ تھی۔

ooo

CURFEW SAKHT HAI

SHORT STORIES

by

Anees Rafi

Distributors

KITABISTAN

Chandwara, Muzaffarpur-842001